ماہنامہ

ایوانِ اردو دہلی

ستمبر ۲۰۰۰ء

علی سردار جعفری نمبر

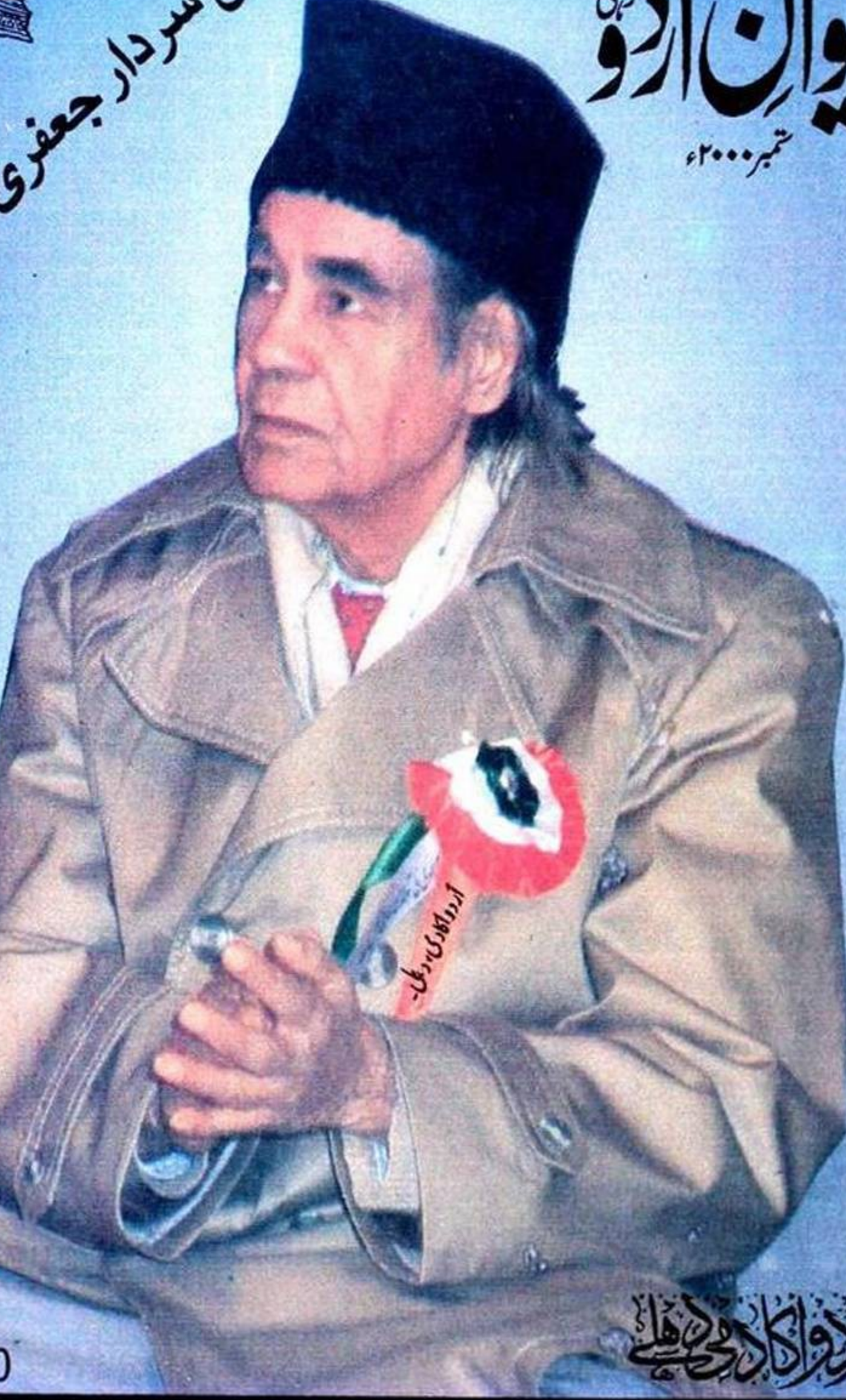

اردو اکادمی دہلی

Rs.7.00

www.taemeernews.com

سوانحی خاکہ

نام : علی سردار جعفری

خاندان : سادات جعفری

وطن : بلرام پور، ضلع گونڈہ

والد کا نام : سیّد جعفر طیّار جعفری

والدہ کا نام : زاہدہ خاتون جعفری ۔

دادا کا نام : سیّد مہدی حسن جعفری

بہن بھائی : سات بہنیں (بالترتیب زبیدہ خاتون، جعفری خاتون، فخر النساء، صادقہ خاتون، قمر النساء، رباب بانو اور شہر بانو۔
ایک بھائی ظفر مہدی۔

تاریخ پیدائش : ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء (بلرام پور، ضلع گونڈہ)

تعلیم : بی۔اے (دہلی یونیورسٹی، دہلی)

: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۳۶ء میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمی کے جرم میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکالا پڑا)

: ایم۔اے (سال اوّل) لکھنؤ یونیورسٹی (۴۰۔۱۹۳۹ء میں اپنی شاعری میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے پر انھیں فائنل امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور جیل سے رہائی پر بلرام پور میں نظر بند رہے)

شادی : ۱۹۴۸ء (سلطانہ منہاج سے)

اولاد : دو بیٹے اور ایک بیٹی

قید و بند : لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور بنارس سنٹرل جیل آٹھ ماہ۔ جنگ مخالف شاعری کرنے پر (۲) آرتھر روڈ جیل اور سینٹرل جیل ناسک، ڈیڑھ سال (بقول سردار جعفری بلاوجہ)

لسانی واقفیت : اردو، فارسی، انگریزی

وابستگی : (۱) کمیونسٹ پارٹی (۲) کانگریس۔

ملازمت یا پیشہ : کبھی نہیں کی۔

(جاری.... بیک ٹائٹل کی پشت پر)

www.taemeernews.com

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی

علی سردار جعفری نمبر

مدیر: منصور احمد عثمانی

جلد نمبر: ۱۴ ○ شمارہ: ۵ ○ ستمبر ۲۰۰۰ء

"ایوانِ اردو" میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ تمام افسانوں میں نام و مقام اور واقعات میں مطابقت کو اتفاقیہ سمجھا جائے گا۔

فون نمبر
3262693-3276211
فیکس نمبر 3286736

پرنٹر، پبلشر: منصور احمد عثمانی

کمپیوٹر کمپوزنگ: محمد ہارون حسینی

مطبوعہ: شوبی آفسیٹ پریس، گلی گڑھیا
کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

فی کاپی سات روپے
زرِ سالانہ: ۸۰ روپے
بیرونی ممالک: چودہ امریکی ڈالر

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی
گھنٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

حرفِ آغاز ---------- ادارہ ---------- ۴

مضامین:

عقیدے بجھ رہے ہیں... ---------- اندر کمار گجرال ---------- ۵
سردار جعفری کو آخری سلام ---------- پروفیسر محمد حسن ---------- ۷
علی سردار جعفری ترقی پسندی... ---------- پروفیسر گوپی چند نارنگ ---------- ۱۲
سردار جعفری کی شاعری ---------- پروفیسر شمیم حنفی ---------- ۱۸
ہندوستانی ادب میں تخلیقی... ---------- پروفیسر عبدالستار دلوی ---------- ۲۵
چند نوٹے پھوٹے تاثرات اور... ---------- فضیل جعفری ---------- ۳۱
درد کا ساحل ---------- رفعت سروش ---------- ۳۴
شعری اظہار اور سردار جعفری ---------- مظہر امام ---------- ۴۱
شعر و ادب کا شاہیں... ---------- انور عظیم ---------- ۴۷
علی سردار جعفری کی فکری اور... ---------- پروفیسر زاہدہ زیدی ---------- ۵۰
انسان دوستی... ---------- پروفیسر شارب ردولوی ---------- ۵۷
اودھ کی خاکِ حسیں... ---------- زبیر رضوی ---------- ۶۲
وطن گلاب ---------- بیکل اتساہی ---------- ۶۵
مجھ سے نظریں چرا کے... ---------- رفیعہ شبنم عابدی ---------- ۶۸
سردار جعفری کی یاد میں ---------- سلام بن رزاق ---------- ۷۱
نئی دنیا کو سلام اور... ---------- ڈاکٹر علی جاوید ---------- ۷۵
سردار کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی ---------- علی احمد فاطمی ---------- ۸۲
حرکت و انقلاب کا استعارہ علی سردار ---------- ڈاکٹر ہمایوں اشرف ---------- ۸۵
سردار جعفری کی نظمیں تہذیبی سروکار ---------- کوثر مظہری ---------- ۹۱
علی سردار جعفری چند تاثرات ---------- راشد انور راشد ---------- ۹۷
عہد فردا کا شاعر علی سردار جعفری ---------- سرور الہدیٰ ---------- ۱۰۱

شاعری:

ایک سوال (غزل) ---------- بقلم علی سردار جعفری ---------- ۶
مجموعہ صد صفات اک ذات ---------- مخمور سعیدی ---------- ۱۶
خراجِ عقیدت ---------- کفیل آذر ---------- ۴۶
دو زندگی کی بشارتوں کا... ---------- عبدالاحد ساز ---------- ۷۴
نوحہ ---------- مختار نوگانوی ---------- ۹۶

منتخب کلام علی سردار جعفری: ---------- ۱۰۷
تعزیتی پیغامات: ---------- ۱۱۳
خطوط علی سردار جعفری: ---------- ۱۲۱

www.taemeernews.com

اردو دنیا ابھی مجروح سلطان پوری کی وفات کے صدمے سے ابھر بھی نہ پائی تھی کہ اردو شعر و ادب کا ایک اہم ستون اور ترقی پسند تحریک کا روحِ رواں ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ علی سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں پنہاں تھیں ان کا شمار ایک ترقی پسند شاعر، مفکر، دانشور، فلسفی اور ہندوپاک کے صفِ اول کے ادیبوں میں ہوتا تھا۔ ان کی شاعری میں قومیت پر جو پختہ یقین اور انسان دوستی کا جو گہرا جذبہ تھا وہ انھیں اپنے ہم عصروں میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

سردار جعفری مشرقی یوپی کے بلرام پور ضلع میں ۱۹۱۳ء میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ گئے اور اسی دوران تحریک آزادی میں شامل ہوگئے۔ ۱۹۴۰۔۱۹۴۱ء میں غیر ملکی حکومت کے جبر و استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دوبارہ جیل گئے۔ سردار نوجوانی سے ہی اشتراکی نظریۂ فکر سے متاثر تھے۔ سوشلزم، مساوات اور امن کو زندگی بھر وہ اپنی فکر کے لیے مشعلِ راہ بنائے رہے۔

سردار جعفری ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیس کے وقت سے لے کر آخری سانس تک اس سے وابستہ رہے۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کے جرم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بھی نکالے گئے۔ ۴۰۔۱۹۳۹ء میں اپنی شاعری میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے پر انھیں ایم۔اے فائنل کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور گرفتار کرلیا گیا اور پھر آزادی کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی عائد کی گئی تو بمبئی اور ناسک میں ڈیڑھ سال تک قید رہے۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کا کوئی تذکرہ سردار جعفری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ بقول کرشن چندر "علی سردار جعفری کسی ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ پوری تحریک کا نام ہے۔" سردار جعفری صرف ایک شاعر، نقاد، مفکر، دانشور اور مدبر ہی نہیں تھے بلکہ ادبی تاریخ داں بھی تھے، اسی لیے ان کی اہم تصنیف 'ترقی پسند ادب' جو صرف حصہ اول تک ہی شائع ہو سکی اردو کی ادبی تاریخ میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ایک شاعر آتش نوا، پرجوش خطیب، صاحبِ نظر نقاد، ایک پُرامن انقلابی اور انسان دوستی کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہیئت کے تجربے بھی کیے اور نئے موضوعات کو سمویا بھی۔ انسان دوستی کا پیغام اور امن کی محافظت کا احساس ان کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔ سردار جعفری کے یہاں مسلسل حیات کے خیال کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ان کے خیال میں انسانی عظمت محض اسی وجہ سے قائم ہے کہ زندگی کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ لوگ مرتے ہیں مگر انسان زندہ رہتا ہے۔ اس کے اندر سانس لینے والی نیکیاں اور سچائیاں زندہ رہتی ہیں اور ہر دور میں اپنے آپ کو منواتی رہتی ہیں۔

سردار جعفری کی شخصیت آج کے پرتشدد اور فرد دشمن معاشرے میں رواداری، سیکولرزم اور انسانیت کا مینارۂ نور تھی۔ ان کے انتقال سے نہ صرف اردو سماج بلکہ تمام دنیا ایک ممتاز شاعر، ایک حساس مفکر اور ایک معزز دانشور سے محروم ہوگئی ہے، جس نے اپنی روشن فکر، بلند آہنگ اور محنت کش عوام کے تئیں اپنی دردمندی کے واشگاف اظہار کے ذریعے ہندوستان کی کئی نسلوں کی ذہنی نشوونما کی۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس شمارہ میں جعفری صاحب کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا احاطہ ہو اور ہمارا یہ خاص نمبر علی سردار جعفری کی زندگی پر ایک اہم دستاویز ثابت ہو۔ ادارہ ان تمام اہل قلم حضرات کا شکر گزار ہے جنھوں نے ہماری درخواست پر اپنی وقیع نگارشات سے نوازا ہے۔

—ادارہ

www.taemeernews.com

عقیدے بجھ رہے ہیں...

اندر کمار گجرال
سابق وزیر اعظم، ہند

علی سردار جعفری کا انتقال ادبی دنیا کے لیے بہت دردناک سانحہ ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے کئی موڑوں پر ان کا تعاون بے پناہ وسیع تھا۔ آزادی کے بعد کچھ کم نظروں نے ہندی اردو کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی۔ سردار جعفری ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اس خلیج کو پاٹ کر دائمی رشتوں کو مضبوط کیا۔ آج اردو کے لیے ماحول میں جو خوشگوار تبدیلی آئی ہے اس میں سردار جعفری کا خاصا دخل ہے۔

عام طور پر جب کبھی ترقی پسند مصنفین کے متعلق بات کی جاتی ہے تو یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ اس تحریک کی دین صرف اردو ادب کو نہیں تھی۔ اس تحریک نے ہر زبان کو نئی سوچ دی تھی۔ اس کا اثر اردو زبان پر تو تھا ہی، لیکن ہندی اور کوئی دیگر زبان ایسی نہیں تھی جس نے اس سوچ کو نہ اپنایا ہو۔ منشی پریم چند کی بات مجھے یاد آرہی ہے: 'ہمیں حسن کے معنی بدلنے ہیں' اس میں انھوں نے یہ سمجھایا کہ پسماندہ اور غریبوں کے ساتھ دوستی ہندوستان کی آزادی کا حصہ ہے۔ سردار جعفری نے اپنے آپ کو ساری عمر ایسے مقاصد کے ساتھ وابستہ رکھا جو انسان دوستی کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔

میں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھتا ہوں کہ میری سردار جعفری کے ساتھ دوستی عمر بھر کی تھی۔ یہ رشتہ طالب علمی کے زمانے میں شروع ہوا تھا جو آخر تک قائم رہا۔ جب آخری بار میں اور میری بیوی ان سے ملے تو ایسا لگتا تھا کہ ان کی آنکھیں منجمد ہو گئیں ہیں، ان کے قریب بیٹھ کر مجھے وہ زمانہ یاد آتا رہا جو ہم نے ان کی صحبتوں میں گزارا تھا خاص طور سے جب وہ ماسکو میں ہمارے ساتھ قیام پذیر تھے۔ اس وقت سردار جعفری نے ایک شعر کہا تھا:

عقیدے بجھ رہے ہیں شمعِ جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی ہے

میں آج اپنے عزیز دوست کی جدائی میں بہت غمگین ہوں۔

□□□

اردو اکادمی، دہلی کے ایک پروگرام میں جناب علی سردار جعفری اور جناب اندر کمار گجرال محو گفتگو ہیں۔ پیچھے نظر آرہے ہیں دہلی کے سابق لیفٹننٹ گورنر جناب ایچ۔ کے۔ ایل کپور

www.taemeernews.com

آخری سوال

۲۸

سردار جعفری

www.taemeernews.com

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

سردار جعفری کو آخری سلام

پروفیسر محمد حسن

D-7 ماڈل ٹاؤن، دہلی 110009

سردار جعفری سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی مگر نام بہت پہلے سن رکھا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب پہلی بار بعض صوبوں میں کانگریس کا راج قائم ہوا تو اتر پردیش میں بھی کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اسی زمانے میں اردو کی تین کتابوں پر ڈھائی سو یا پانچ پانچ سو روپے کے انعامات ملے۔ اسرار الحق مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ علی سردار جعفری کا افسانوں کا مجموعہ اور سید سبط حسن کی تاریخ سے متعلق کوئی کتاب کا نام اب یاد نہیں۔ تینوں دوستوں نے انعام کی یہ رقم جمع کر کے رسالہ 'نیا ادب' نکالنے کا ارادہ کیا۔ سید حسن ظہیر کا ایک مکان حضرت گنج کے نواح میں خالی پڑا تھا وہاں دفتر قائم ہو گیا اور رسالہ اس مفلوک الحالی کی حالت میں نکلنے لگا۔ حیات اللہ انصاری کانگریس کے اردو اخبار 'ہندوستان' کے مدیر تھے جس میں ڈاکٹر محمد اشرف کے مضامین قسط وار چھپا کرتے تھے۔

میری ملاقات نہ سردار جعفری سے تھی نہ 'نیا ادب' سے البتہ ان دونوں کے نام سنا کرتا تھا پھر جب ۱۹۴۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے بی اے میں داخلہ لیا تو قریب سے تو نہیں دور سے ان دونوں سے واقفیت ہوئی۔

سردار سے میری ملاقات تو بہت بعد کو ہوئی مگر غائبانہ ملاقات البتہ خاصی تفصیلی ہو گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں دستور یہ تھا کہ ایک سال مسلمان امیدوار یونین کا صدر منتخب ہوتا تھا اور اس سال سکریٹری ہندو ہوتا تھا اس کے بعد دوسرے سال ہندو صدر اور مسلمان امیدوار سکریٹری منتخب ہوتا تھا۔ سردار جعفری نے جس سال لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا یعنی داخلہ لینے کے چند ماہ بعد ہی صدارت کے امیدوار ہوئے۔ مقابل تھے لکھنؤ یونیورسٹی کے پرانے طالب علم علی جواد زیدی اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ نووارد سردار جعفری منتخب ہو گئے۔

علی سردار جعفری علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ وہیں پہلی بار اسرار الحق مجاز کی ملاقات علی سردار جعفری سے ٹینس کورٹ میں ہو گئی تھی جہاں دونوں ٹینس کھیلنے جایا کرتے تھے دونوں میں سے کوئی بھی ان دنوں ادبی دنیا میں مشہور نہیں ہوا تھا مگر یہ دوستی ادبی شہرت مل جانے کے بعد بھی قائم رہی۔

علی گڑھ کی یادوں میں فلک نما کوٹھی کی یادیں بھی تھیں جہاں سلطانہ رہتی تھیں جن سے سردار نے شادی کی اور جنھیں اپنی نظم 'میرا سفر' کے ایک مصرعہ میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے

علی گڑھ میں سردار جعفری کا زمانہ خاصہ طوفانی زمانہ تھا۔ دراصل اس زمانے کا علی گڑھ بڑے انقلابی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ وہاں ڈاکٹر علیم بھی تھے اور پروفیسر حبیب بھی۔ خواجہ منظور حسین بھی تھے اور شہیبہ الدین لائبریرین بھی ایک طرف خاکساروں کے لیڈر بھی اسٹاف میں شامل تھے اور دوسری طرف ڈاکٹر ضیاء الدین جیسے لوگ بھی تھے مگر علی گڑھ میں سردار جعفری کی اس دور کی سرگرمیوں کی تفصیلات معلوم نہیں البتہ وہاں سے نکلے تو ان پر مارکسزم اور کمیونزم کے اثرات غالب تھے اور ان دونوں سے بڑھ کر قوم پرستانہ خیالات تھے جو ملک کو آزاد دیکھنے اور ہر قسم کی طبقاتی اور دقیانوسی ظلم و ستم سے محفوظ دیکھنے کی خواہش سے عبارت تھے۔

اس زمانے میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ سر مارس گائر ان دنوں ہندوستانی کی عدالت عالیہ کے جج تھے اور بعد میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مقرر ہو گئے تھے۔ انھوں نے باغیانہ سرگرمیوں کے الزام میں مقیم الدین فاروقی کو دہلی یونیورسٹی سے

www.taemeernews.com

نکال دیا کیوں کہ انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف سخت تقریر کی تھی اس پر قوم پرست طلبا نے ہڑتال کی اور ان پر لاٹھی چارج ہوا۔

علی سردار جعفری ان دنوں لکھنؤ آگئے تھے۔ سر مارس گائر غالباً لکھنؤ یونیورسٹی کا کانووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے لکھنؤ آئے تو سردار جعفری کی سربراہی میں ان کے خلاف مظاہرہ کیا گیا، لاٹھی چارج ہوا اور سردار کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

جب اتر پردیش میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اور 'نیا ادب' نکلنے لگا تو سردار جعفری نے سبط حسن اور مجاز سے مل کر اس رسالے کے ذریعے قدامت پرستی اور بیرونی حکومت کے خلاف آزادی کی آواز اٹھائی۔ یہ مہم ہر قسم کی قدامت پسندی کے خلاف تھی۔ 'انگارے' کے نام سے افسانوں کا جو انتخاب چھپا تھا وہ ضبط ہو چکا تھا اور اسے فحش قرار دیا گیا تھا۔ 'انگارے' کی اسی روایت آزادیٔ تحریر و تقریر کو 'نیا ادب' نے اپنا منشور بنا رکھا تھا۔

'نیا ادب' نے اردو ادب میں نیا رجحان پیدا کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ترقی پسندی کی طرف میلان عام کیا۔ تھوڑے دنوں بعد جوش ملیح آبادی کا رسالہ 'کلیم' بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے اور اس کا نام 'نیا ادب' اور 'کلیم' قرار پایا۔ رسالے کے شمارے خاصی بے ترتیبی سے نکلے۔ مالی دشواریاں بھی تھیں، جن میں سے بعض کا ذکر سردار جعفری نے 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' میں کیا ہے۔ خاص طور پر وہ واقعہ جب یہ لوگ کسی دوست کے ہاں 'نیا ادب' کا زرِ سالانہ وصول کرنے گئے تھے اور انھوں نے جو کرنسی نوٹ دیا اس کی نقدی بھی ان تینوں دوستوں کے پاس نہ تھی یا کسی طرح ایک انگریز (یا امریکی) سپاہی اپنے کتے کا نام ٹیپو رکھ کر اسے مے فیئر سنیما لکھنؤ کے سامنے اس کے نام سے اسے پکار رہا تھا۔ ان تینوں کی قومی غیرت جوش میں آئی اور انھوں نے ایک بازاری کتے کو نیلسن نام دے کر پکارنا اور چمکارنا شروع کیا۔ اس پر اس انگریز یا امریکی سپاہی کو غصہ آگیا اور نوبت مار پیٹ تک پہنچی۔ اتفاق سے ان دوستوں کے ساتھ ایک کشمیری چک نامی 'پانیر' کے سب ایڈیٹر تھے وہ تنومند تھے اور انھوں نے اس انگریز یا امریکی کی پٹائی کر دی۔ سردار جعفری کے بیان کے مطابق مجاز اس دوران ناچ ناچ کر "بول اری او دھرتی بول" گیت کے بول دہرانے لگے۔

اسی رسالہ 'نیا ادب' کے ایک شمارے میں محمد حسن عسکری کا افسانہ 'پھسلن' چھپا تھا جو بعض لوگوں کے بیان کے مطابق فراق صاحب سے حسن عسکری کے ذاتی تعلقات کا افسانہ ہے مگر اس افسانے کو فحش قرار دیا گیا۔ نیا ادب ہی پر منحصر نہیں اس دور کے نئے ادب میں ترقی پسندی اور عریاں نگاری کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ حد یہ ہے کہ 'انگارے' پر بھی پابندی انقلابی افسانوں کے بجائے عریاں افسانوں کی بدولت عائد ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ن۔ م۔ راشد، میراجی اور سعادت حسن منٹو کو بھی ترقی پسندوں کا امیر کارواں سمجھا جاتا تھا اور خود 'انگارے' میں بھی سجاد ظہیر اور احمد علی تک افسانوں میں عریانی بھی موجود ہے اور اس زمانے کے معیار کے برخلاف مذہبی اور سماجی اعتبار سے قابل اعتراض تھا۔

'نیا ادب' جلد ہی بند ہو گیا اور سردار جعفری جیل کے پہلے تجربے کے بعد سیاست کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ ان کی شاعری میں بھی یہی ہنگامی لہجہ در آیا۔ آخر کار ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ہٹی اور پارٹی کا باقاعدہ دفتر بمبئی میں قائم ہوا اور اس کا اخبار 'قومی جنگ' شائع ہونے لگا تو سردار جعفری بھی بمبئی پہنچے اور پارٹی میں کل وقتی کارکن ہو گئے۔ 'قومی جنگ' (اردو) کی ادارت میں بھی سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ شامل ہوئے اور پارٹی کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی شریک ہو گئے۔ اسی زمانے میں انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے لیے بھی سردار جعفری نے کئی گیت اور ڈرامے لکھے۔ بعد کو ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ 'یہ کس کا خون ہے' نام کا ڈراما بھی خواجہ احمد عباس کے ساتھ مل کر لکھا۔

پھر کمیونسٹ پارٹی کی سیاست نے ایک نئی کرٹ لی۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی بحریے کی بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کی کمیونسٹ پارٹی نے بھرپور حمایت کی۔ اس پر نظمیں سردار نے بھی لکھیں اور اسے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیا۔ یہ صحیح بھی تھا کیوں کہ انگریز حکومت نے اسے خطرے کی گھنٹی سمجھ کر ہندوستان کو آزاد کرنے کی ٹھان لی اور آخر کار لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ فسادات اور لاکھوں آدمی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے

www.taemeernews.com

ادھر ہو گئے۔

اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی نے انقلابی حکمت عملی اپنائی اور ۱۹۴۸ء میں پارٹی نے انقلاب کا نعرہ دیا تلنگانہ اور شمھاگا کی تحریکیں شروع ہوئیں ملک بھر میں طویل ہڑتال کا نعرہ دیا گیا مگر ہڑتال کہیں نہیں ہوئی۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے۔ انھوں نے پارٹی پر پھر پابندی لگادی اور اسی دوران سردار جعفری پھر جیل چلے گئے۔ البتہ اسی زمانے میں پارٹی کے ایک خفیہ سرکلر میں سردار جعفری کے جیل میں اسٹاف سے دوستی بڑھانے اور مراعات حاصل کرنے کے الزام میں پارٹی سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ملی۔

تحریک ختم ہوگئی مگر سردار جعفری کی شاعری کا رنگ نہیں بدلا۔ ان کی شاعری کا رنگ خالص ہنگامی تھا ان کی نظموں میں نعرہ بازی کی گونج تھی ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا انداز تھا، تقریر کا لب ولہجہ تھا اور یہی لب ولہجہ سردار جعفری کی شاعری کے ذریعہ وقت کا دستور بنا جارہا تھا۔ سردار کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ اس سے الگ جو دوسرے شعری لہجے رائج تھے ان کی سخت تنقید سردار نے رسالہ 'شاہراہ' دہلی کے مختلف مضامین میں کی۔ پہلا مضمون جذبی کے نام ایک خط کی شکل میں تھا جس میں اعتراض کیا گیا ہے کہ عمومی لہجے میں شاعری غلط فہمی پیدا کرسکتی ہے شاعری میں وضاحت ضروری ہے۔ جذبی کی نظم 'نیا سورج' میں تمثیل کے ذریعہ آزادی پر تبصرہ تھا یہی اعتراض سردار نے بعد میں فیض کی نظم 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' پر بھی کیا کہ یہی بات تو قدامت پسند جن سنگھی بھی کہہ سکتا ہے۔ فراق صاحب کا ایک مضمون 'شاہراہ' میں چھپا تھا اس کی مخالفت میں سردار نے 'یہ ترقی پسندی نہیں ہے' کے عنوان سے جوابی مضمون لکھا۔ غرض جلد ہی سردار کی شعری ہی نہیں فکری جہت بھی متعین ہوگئی۔ اور یہ جہت تھی براہ راست ہنگامی شاعری کی جہت۔ اس کے لیے سردار نے آزاد نظم کو راشد، میراجی کی گرفت سے آزاد کرکے نئی معنوی جہت بخشی تھی اور ان کی طویل نظموں میں تکرار کے باوجود تقریر کا سا انداز تھا۔ یہ دور تھا بھی نظم کا دور اور کم سے کم ہندوستان میں نظم کا اسلوب طے کرنے میں سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم مرتبہ تھا۔

'نئی دنیا کو سلام' کو ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ چھپی تھی مگر اس میں بھی آزاد نظم کے ٹکڑوں سے براہ راست خطیبانہ انداز بیان اختیار کیا گیا تھا اسی رنگ سخن کو سردار نے 'پتھر کی دیوار' اور 'خون کی لکیر' میں اور آگے بڑھایا اور اس میں شک نہیں کہ یہی رنگ سخن کم سے کم ہندوستان میں عام ہوگیا۔ غزل کی طرف شعرا کی توجہ کم ہونے لگی حد یہ ہے کہ جگر مرادآبادی جیسے ٹھیٹھ غزل گو شاعر بھی یا تو نظم نما غزلیں کہنے لگے یا پھر براہ راست 'ساقی سے خطاب' جیسی نظمیں ہی کہنے لگے۔

غرض یہ دور کم وبیش سردار کا دور کہا جاسکتا ہے اسی دور میں وہ شاعری کی طرف تیزی سے رجوع ہونے اور ان کی شعریت سے تقریباً محروم نظموں کو کسی قدر مقبولیت بھی ملی مگر ان کا لہجہ اور اسلوب دونوں ہنگامی تھے اور

ایک طرف گورکی ایک طرف ایلیٹ

جیسے مصرعے جلد ہی سپاٹ گردانے جانے لگے۔

سردار جعفری اس منزل پر بھی تھک ہار کر بیٹھ جانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اسی زمانے میں 'ترقی پسند ادب' نام کی کتاب لکھی جو اس دور کی ترقی پسندی کو تقریباً سبھی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ احتشام حسین، ممتاز حسین اور ان دونوں سے بڑھ چڑھ کر خود سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری نے کبھی ترقی پسند تحریک پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ سجاد ظہیر نے 'روشنائی' لکھی بھی تو محض تحریک کے تنظیمی پہلو کو پیش نظر رکھا باقی باتیں ضمنی طور پر تھیں ہاں عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کے نظریے اور تحریک پر پہلی مستقل کتاب لکھی تھی اور آج بھی اس تحریک پر کسی جائزے کو منصفانہ اور غیر جانبدارانہ کہا جاسکتا ہے تو عزیز احمد ہی کتاب ہے۔ سردار جعفری نے تمام ترقی پسند نقادوں کے برعکس ترقی پسندی کا خاصہ سخت گیر رویہ اپنایا۔ حد یہ ہے کہ پریم چند، راشد اور سعادت حسن منٹو بھی ان کی ضرب کلیمی سے نہ بچے بعد کو سردار خود بھی شاید اتنے شدت پسند نہیں رہے تھے جو اقبال سے ان کی غیر معمولی عقیدت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس زمانے کے قصے، حکایتیں اور واقعات تو بے شمار ہیں مگر ان سب سے قطع نظر کرنا واجب ہے۔ آخر ہوا یہ کہ سردار

www.taemeernews.com

کمیونسٹ پارٹی سے تو باہر آگئے مگر نہرو پر نظمیں اور حکومت ہند کی خارجہ حکمت عملی کی ستائش ان کی شاعری میں جگہ پانے لگی۔ ریڈیو اسٹیشن پر ان کے کلام کے نشر نہ ہونے پر پابندی بھی ہٹی بلکہ وہ اس کے اعزازی مشیر قرار دیے گئے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ۱۹۶۵ء کی لڑائی تاشقند معاہدے پر ختم ہوئی تو سردار نے جنگ کی حمایت میں بھی نظمیں لکھیں اور جب تاشقند کا سمجھوتہ ہوا تو اس پر اپنی معرکۃ الآرا نظم لکھی جس کا کیسٹ حال ہی میں بھارتیہ جنتا پارٹی والے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نواز شریف سے ملاقات کرتے وقت پاکستان لے گئے تھے۔

اسی دوران سردار جعفری نے اپنی سرگرمیاں مختلف شعبوں میں بہت تیز کر دیں۔ اول تو ایک صنعت کار اور ادب نواز دوست شیام کرشن اگم کے تعاون سے ہندوستانی ٹرسٹ بمبئی میں قائم ہوا اور اردو کی مختلف اصناف کے انتخابات شائع ہونے لگے دوسرے غالب، کبیر اور میرابائی کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوا جسے سردار نے مرتب کیا تھا۔ تیسرے سہ ماہی رسالہ 'گفتگو' کا آغاز ہوا جو خاصہ ضخیم رسالہ تھا اور ہر قسم کے ادبی مال مسالے سے مالا مال تھا یہی دور جدیدیت کے عروج اور ترقی پسندی پر ان کے بڑھتے ہوئے حملوں کا زمانہ بھی تھا مگر 'گفتگو' نے خاصہ بین بین کا رویہ اختیار کیا۔ چوتھے سردار نے فلم سازی بھی شروع کر دی اور 'گیارہ ہزار لڑکیاں' نام کی فلم بنائی جو چلی نہیں۔ کچھ ہی سال بعد اپنے معاصر اردو شاعروں پر ٹیلی وژن پر کئی قسطوں میں ایک سلسلہ بھی پیش کیا:

اور اسی کے ساتھ ان کی شاعری اور ان کی فکر کا سفر بھی جاری رہا۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے کئی بین الاقوامی مذاکروں میں شرکت کی اور ایک زمانہ وہ بھی تھا جو دنیا کے انقلابی فن کاروں میں ایلیا ایرن برگ، لوئی اراگاں اور پبلو نرودا کے ساتھ سردار جعفری کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ پھر وہ دور بھی آیا کہ سردار نے قاہرہ کے کسی قہوہ خانے میں اپنی مشہور اور نہایت مسجع نظم 'تین شرابی' سنائی اور در و دیوار جھوم اٹھے۔ پھر پبلو نرودا ہی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر ان کی نظم 'میرا سفر' لکھی گئی جو بعض اضافے اور ترمیموں کے باوجود نرودا کی نظم ہی کا چربہ تھی مگر اردو میں بے حد مقبول ہوئی۔ آج بھی ذاتی طور پر میرے لیے سردار جعفری غزل کے تین اشعار اور تین نظموں کے شاعر ہیں جن میں بلاشبہ 'تین شرابی' اور 'میرا سفر' نظمیں شامل ہیں اور غزل کے وہ تین شعر جن میں وہ بے پناہ مصرعہ بھی ہے: (جس نظم کی نشان دہی باقی رہ گئی ہے اس کی نشان دہی کیا ضرور ہے)

راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

جی ہاں! راستے سب بند تھے تو اب انقلاب کے بجائے اعزاز و اکرام کی طرف متوجہ ہونے کا بھی وقت آگیا تھا اور انقلابی رویے کی تبدیلی کا اظہار 'ایک خواب' اور مجموعے کے چند سطری دیباچے اور خود اس نظم کے لہجے اور نفس مضمون سے ہو جاتا ہے اور آخر تک انھوں نے یہی رنگ نبھایا۔ یعنی سیاسی حزب مخالف سے گریز اور ارباب اقتدار کو 'قومی لیڈر شپ' کی حمایت۔

پھر انعامات اور مشاعروں کے سلسلے تھے۔ انھیں جب بھی کوئی بڑا انعام ملا مبارک باد کے چند جملوں کے خط میں یہ شعر ضرور لکھا:

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

یعنی خوش قسمتی تو لعل و گہر کی ہے کہ وہ تیری کلاہ تک جا پہنچے ہیں اور کیا کیا اور کیسے کیسے انعام اور کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھ سے انعام ملے۔ سردار ہی کا ظرف تھا کہ ان سب کو قبولیت ملی۔

مشاعروں میں بھی سردار نے اکثر اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ ان کے لہجے میں ایک منفرد قسم کی دلکشی تھی جو مصرعے اور اشعار تو کیا نثر کے جملوں میں زندگی پیدا کر دیتی تھی۔ نہ جانے کس کا مصرعہ ہے:

حیات بانٹ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

یہی کیفیت سردار کی شعر خوانی ہی نہیں گفتگو کی بھی تھی اور نثر کے سجے سنورے جملے پڑھنے کی بھی۔ مشاعروں میں ملک کے باہر دور دراز کے شہروں اور ملکوں کے مشاعروں میں بھی انھیں یہی بلکہ اپنے ملک سے کہیں بڑھ چڑھ کر مقبولیت حاصل تھی۔ کینیڈا اور لندن اور دہلی کی محفلوں میں ان کی تقریر اور شعر خوانی کی مقبولیت دیکھ چکا ہوں۔

ان کی تحریروں میں خصوصیت کے ساتھ ذکر واجب ہے ان کی انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین کا جن میں سے صرف دو کا

www.taemeernews.com

تذکرہ ہی کافی ہوگا ایک اردو کے بارے میں 'انڈین لٹریچر' بمبئی کے شمارے میں ہے جس میں اردو کی لسانی انفرادیت پر زور دیا گیا ہے اور مدلل انداز میں اردو کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا 'السٹریٹڈ ویکلی' میں ان کی پچھلی بار علالت کے موقعے پر شائع شدہ ایک مضمون ہے جب انھیں دل کا دورہ پڑا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ جو لوگ آئیں وہ بیماری اور موت کا ذکر نہ کریں مگر خود ڈاکٹر سے لے کر تمام آنے جانے والوں تک کی تمام تر گفتگو انھیں دونوں موضوعات پر ہوتی تھی اور انھیں احساس نہیں ہوتا تھا۔

سردار جعفری چلے گئے دکھ ہے تو یہ کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں والا ایک ہی ادیب ہمارے درمیان تھا اور وہ بھی اپنی صلاحیتوں کا بہت تھوڑا بہت چھوٹا سا حصہ ہی قومی وراثت کو دے پایا تھا کہ موت نے اس کے ہاتھوں سے قلم اور زبان سے جادو چھین لیا۔ آخری دور کی شاعری ہی میں شعری کیفیات کی بوقلمونی جلوہ دکھانے لگی تھی کہ خاموشی کا پیغام آگیا۔ اب انتظار ہے تو ان کا جن کے بارے میں سردار جعفری نے 'میرا سفر' میں لکھا تھا کہ ان کے زبان سے بولوں گا اور ان کی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

آج بھی یہ خیال آتا ہے کہ غالب کے لفظوں میں سردار جعفری کے لیے بھی قدرت نے .نو صلاحیتیں اور جس قسم کے کمالات ودیعت کیے تھے وہ سو میں سے ایک فی صد بھی پوری طرح ظہور میں نہ آئے پھر بھی اس نامکمل سے اظہار نے اردو ہی کو نہیں ہماری پوری قومی زندگی کو منور کیا۔ بقول شخصے جادو الفاظ میں نہیں شخصیت میں ہوتا ہے اور جب یہ شخصیت بولتی ہے تو سارا عالم گوش بر آواز ہو جاتا ہے۔ ایسی شخصیت تھی سردار جعفری کی جس کا اظہار بہت تھوڑا سا اظہار سردار کی ہمہ جہات سرگرمیوں میں ہوا اور اسی شکوے کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو گیا:

نہ بزم آسمان و یک ذرہ در سماع
آں ہم بہ کام دل نہ فشاند آستین خویش

(نو آسمانوں کی وسعت میں ایک ذرہ رقص میں ہے اور اسے بھی اتنی وسعت نہیں ملی کہ جی بھر کر اپنی آستینیں پھیلا سکے)

اس مضمون کا خاتمہ سردار جعفری کے میرے نام آخری خط سے کرتا ہو جو انھوں نے بمبئی سے ۲۰ر جنوری ۱۹۹۸ء کو لکھا تھا:

"برادرم تسلیم!

گیان پیٹھ انعام پر مبارک باد کا شکریہ!

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اس سال نثر و نظم کی دو جلدیں شائع کرنے کا خیال ہے۔ نظم کا انتخاب کر لیا ہے۔ نثر کے مضامین جمع کرنا ہیں۔

فی الحال چند کتابیں شائع ہو رہی ہیں جو مارچ اپریل تک آجائیں گی۔

۱۔ غالب کا سو منات خیال اردو مرکز، پٹنہ
۲۔ کبیر بانی (ہندی) راج کمل، نئی دہلی
۳۔ کبیر بانی (اردو) انجمن ترقی اردو، دہلی
۴۔ دیوانِ غالب (ہندی، اردو) دہلی
۵۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں (ہندی) راج کمل
۶۔ سرمایۂ سخن (شاعری کی لغت) مکتبہ جامعہ
۷۔ اقبال، کمیونزم اور اسلام پر انگریزی میں کتاب۔ پٹنہ
۸۔ گیان پیٹھ انعام کی تقریب سے پہلے منتخب نظموں کا شعری مجموعہ (ہندی)

اس وقت اردو کی پانچ کتابیں بازار میں ہیں:

۱۔ پتھر کی دیوار (پاکٹ بک) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔
۲۔ ایک خواب اور
۳۔ لہو پکارتا ہے
۴۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں
۵۔ پیغمبرانِ سخن (بمبئی)

تہنیت کا دوبارہ شکریہ۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا
سردار جعفری

□□□

□□□

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری: ترقی پسندی کے تاج کا نگینہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ
D-252، سرودیہ انکلیو، نئی دہلی 110017

علی سردار جعفری (۲۰ر نومبر ۱۹۱۳ــــ یکم اگست ۲۰۰۰ء) ترقی پسندوں کے سب سے بڑے قافلہ سالار تھے۔ سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند، فیض احمد فیض، احتشام حسین اور مخدوم محی الدین کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے۔ پہلی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس جو اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی، اور جس کا افتتاح پریم چند نے کیا تھا، اس کی دستاویزی تصویر میں علی سردار جعفری ایک طرف کو موجود ہیں۔ شروع میں تخلص 'حزیں' تھا۔ آزادی کے بعد انھوں نے ترقی پسند ادب پر اپنی جامع کتاب لکھنے کے بعد ترقی پسندی کی نظریاتی باگ ڈور تماماً اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کتاب کے پہلے دو باب بنیادی نوعیت کے ہیں جن میں انھوں نے کاڈویل اور پھر پریم چند اور جوش سے بحث کی ہے۔ ان کے بنیادی نظریاتی تصور انقلابی رومانیت کی تشکیل انھیں بنیادوں پر ہوئی تھی۔ جوش ان کے ہیرو تھے۔ ان کی شاعری میں جو براہ راست خطابت کا میلان ہے وہ کسی حد تک جوش کی دین ہے۔ شاعری، خطابت اور نثر تینوں میں انھوں نے اپنا لوہا منوایا۔ فعال شخصیت کا اثر یوں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے انھیں ہمیشہ نعل در آتش دیکھا، تخلیقی، سماجی، سیاسی تینوں سطحوں پر وہ برابر سرگرم رہے۔

تاریخی اعتبار سے کتنے نشیب و فراز آئے، ان کے کمٹ منٹ میں کمی نہیں آئی۔ ان کی شاعری کی امتیازی اقدار انسان دوستی، حریت پسندی اور وطن پرستی ہیں۔ ان کا ذہنی سفر سامراج کے خلاف للکار سے شروع ہوا۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، کچلے دبے انسانوں کی حمایت اور سماجی انصاف پسندی کے لیے انھوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ ہندستان کی رنگارنگ تہذیب کے وہ دلدادہ تھے، اردو معاشرے کے کمزور ہو جانے کا انھیں دکھ تھا۔ فرقہ واریت اور تشدد کی انھوں نے ہمیشہ مذمت کی اور امن و آشتی کے لیے برابر آواز اٹھاتے رہے۔ ترقی پسندی کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ اس نے ہندستان کے عوام سے رشتہ جوڑا جس سے اردو کی مقبولیت میں شدید اضافہ ہوا، اور اردو جو پہلے سے تحریک آزادی کی نقیب تھی، بعد میں اور بھی زور شور سے اس میں شریک ہوئی۔ اس زمانے میں اردو ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت ہندستانی ادب میں ہراول دستے کی تھی۔ بائیں بازو کا نقیب ہونے کی وجہ سے اردو شاعروں نے ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں سے رشتے استوار کیے۔ سماجی مسائل پر سب میں اتفاق تھا۔ علی سردار جعفری ذاتی طور پر ہندی والوں میں خاصے مقبول رہے۔ یہ ہم آہنگی اور یگانگت اردو کی بڑی طاقت تھی جو بعد کے زمانے میں ویسی نہیں رہی۔ غالباً اسی رفاقت کے پیش نظر علی سردار جعفری نے اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کو ہندی والوں کے سامنے رکھنا چاہا۔ انھوں نے دیوانِ غالب کا ڈی لکس ایڈیشن بڑے سائز میں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں اپنے نہایت عمدہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے لیے روپیہ انھوں نے پنجاب نیشنل بنک کے لالہ یوگ راج سے حاصل کیا جو غالب اور اردو دونوں کے عاشق تھے۔ اس ایڈیشن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ہندی والوں میں غالب کی مقبولیت میں تو اضافہ ہوا ہی، علی سردار جعفری کی تنقیدی نظر کی بھی دھاک بیٹھ گئی۔

علی سردار جعفری البیلے انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں

www.taemeernews.com

ایک خاص طرح کی دلنوازی اور کشش تھی جو ان کی مقبولیت میں اضافے کا باعث تھی۔

ہندستان کا بڑے سے بڑا ادبی ایوارڈ ان کو حاصل ہوا۔ غالباً پدم شری کا اعزاز انھیں اندرا گاندھی کے زمانے میں ملا تھا۔ ہندستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز بھارتیہ گیان پیٹھ ابھی انھیں دو برس پہلے حاصل ہوا۔ اس سے قبل سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، غالب ایوارڈ، سنت گیانیشور ایوارڈ اور مختلف اردو اکیڈمیوں کے بیسیوں اعزازات انھیں حاصل ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ترقی پسندوں میں جیسی تنقیدی نظر علی سردار جعفری کی تھی ویسی کسی کی نہیں۔ میر تقی میر، میرابائی اور کبیر کے انتخابات بھی انھوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کیے۔ بعد میں ان کے یہ مضامین "پیغمبران سخن" نام کی کتاب میں شائع ہوئے۔ غالب، حافظ، رومی اور اقبال کے وہ عاشق تھے۔ اساتذہ کا بیشتر کلام ان کو حفظ تھا۔ "ترقی پسند ادب" میں انھوں نے جن لوگوں کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کیا، ان میں اقبال اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔ بعد میں ان کی رائے میں تبدیلی آئی اور انھوں نے 'اقبال شناسی' شائع کی اور اقبال صدی منانے میں بھی پیش پیش رہے۔ نظریاتی طور پر جس طرح ان کی پسند و ناپسند میں تبدیلیاں آتی رہیں اس پر کچھ لوگوں کو اعتراض تھا، لیکن یہ تبدیلیاں ان کے ذہنی سفر کا نتیجہ بھی تھیں۔ غالی ترقی پسندوں نے ان پر سمجھوتہ بازی کا الزام بھی لگایا۔ سیاست میں تو یہ ہوتا ہی ہے۔ "نومبر میرا گہوارہ" میں انھوں نے اپنے معترضین اور حاسدوں کو جواب بھی دیا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ان کی خوبصورت پیکر تراشی ہے جو شروع کی نظموں سے لے کر آخر تک ملتی ہے۔ لگتا ہے کہ اپنے اظہار کی اس قوت کا جتنا فائدہ وہ اٹھا سکتے تھے اپنی مصروفیات کی وجہ سے انھوں نے نہیں اٹھایا۔ 'پتھر کی دیوار' میں شامل نظم "نیند" اس اعتبار سے بے مثل ہے۔ جیل کی سلاخوں کا منظر ہے اور رات کی کیفیت:

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں باہیں
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی!

ویسے ان کے ادبی سفر کا آغاز افسانوں کے ایک مجموعہ 'منزل' سے ہوا جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ پہلا مجموعہ کلام 'پرواز' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں آیا۔ اس کے بعد 'نئی دنیا کو سلام' (۱۹۴۸ء)، 'خون کی لکیر' (۱۹۴۹)، 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۱ء) اور 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) شائع ہوئے۔ 'پتھر کی دیوار' سے ان کی شہرت میں بے حد اضافہ ہوا۔ بعد میں 'ایک خواب اور'، 'پیرہن شرر' اور 'لہو پکارتا ہے' تین مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۸ء کے بعد کی بہت سی نظمیں ہنوز کسی مجموعے میں مرتب نہیں ہوئی اگرچہ صہبا لکھنوی نے کراچی سے افکار کا جو علی سردار جعفری نمبر شائع کیا تھا اس میں بعض چیزیں شامل ہیں۔

ادھر ہند پاک دوستی کے حوالے سے ساتویں دہائی میں علی سردار جعفری نے جو نظمیں لکھی تھیں ان کی بازگشت ابھی دو برس پہلے سنی گئی جب ہندستان کے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی امن پیش کش کے لیے لاہور گئے اور یہ نظم 'سرحد' کے نام سے بار بار چھپی اور پڑھی گئی:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

ہند پاک دوستی کے نام پر ان کی کئی نظمیں ہیں۔ ان میں

www.taemeernews.com

رومانیت کا وفور ہے، لیکن ان کے بعض مصرعے تاریخی نوعیت کے ہیں اور اس قدر خوبصورت ہیں کہ زبانوں پر چڑھ گئے ہیں:

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
سر پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد کی نظموں میں جو شعری مرتبہ "آبلہ پا" یا "نومبر میرا گہوارہ" کا ہے وہ دوسری نظموں کا نہیں۔ بالخصوص "نومبر میرا گہوارہ" میں سوانحی حوالے، وسیع انسانی، سماجی و قومی تناظر میں آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے نظم کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ علی سردار جعفری کی اولین دور کی نظموں میں "پتھر کی دیوار" کے کچھ حصے، نیز "پیرا ہن شرر" اور "اودھ کی خاک حسین" بھی عمدہ نظمیں ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ میں "میرا سفر" کو بھی اہمیت دوں گا۔ یہ نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں علی سردار جعفری کی یاد دلاتی رہیں گی۔ بالخصوص "میرا سفر" جو رومی کے مصرع "ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، زندگی کے اس لامختتم CONTINUUM تسلسل یا CYCLIC تصور کو پیش کرتی ہے جس میں ہندستانی روح کی تڑپ موجود ہے:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے میری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ میرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

آخری حصہ نہایت پر اثر ہے:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل میں
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

مزے کی بات ہے کہ یہ جوانی کی نظموں میں ہے جو ۱۹۵۶ء کے لگ بھگ شائع ہوئی اور بعد میں ہمیشہ کے لیے ان کی پُر حوصلہ طبیعت کا تخلیقی نشان بن گئی۔

علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی کا یہ اثبات اور زندگی کے تسلسل پر یہ ایقان اور اعلیٰ انسانی قدروں پر ان کا ایمان ایسی میراث ہے جس کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر ان کا نام روشن رہے گا۔

کئی بار ہندستان سے باہر کے سفر میں علی سردار جعفری کا اور میرا ساتھ رہا۔ دہلی بھی جب جب آتے تو فون ضرور کرتے اور ملنے کا وقت طے کرتے۔ کینیڈا کے ایک سفر میں فیض اور سردار جعفری دونوں تھے، سلطانہ بیگم بھی تھیں اور کئی دنوں تک قیام ٹورانٹو میں بیدار بخت کے یہاں رہا۔ روز شام کو محفل

www.taemeernews.com

جمتی اور رات گئے تک گفتگو رہتی۔ ایک دو بار پاکستان میں بھی ساتھ ہوا۔ کراچی پریس کلب کے ایک جلسے میں مقامی شعرا نے خاصا وقت خراب کیا۔ بعد میں پوچھا گیا کہ ان شعرا کے کلام کے بارے میں رائے کیا ہے۔ سردار جعفری نے کہا "ہندستان پاکستان کے تعلقات ویسے ہی کشیدہ ہیں، میں رائے دے کر انھیں مزید خراب کرنا نہیں چاہتا"۔

شخص اٹھ جاتا ہے صرف یادیں اور کام باقی رہ جاتا ہے۔ ادھر وہ ایک مدت سے علیل تھے۔ وہ شخص جس کی آواز دہلی کی ادبی محفلوں میں اکثر گونجا کرتی تھی، مہینوں سے خاموش تھا۔ شیلا گجرال صاحبہ نے بمبئی سے واپس آنے کے بعد فون پر بتایا کہ پہچان اور یادداشت جاتی رہی تھی۔ انھوں نے فیکس پر اپنے تاثرات بھجوائے جو ناگری سے اردو کرا کے میں نے اخبارات کو بھجوا دیے۔ دہلی کا آخری جلسہ جس میں وہ شریک ہوئے ان کی نظموں کے انگریزی ترجموں پر مبنی کتاب کی ریلیز کا تھا جنھیں بیدار بخت نے ترجمہ کیا تھا۔ گجرال صاحب موجود تھے۔ اظہار خیال کے لیے مجھ سے کہا گیا۔ کتاب سٹرلنگ نے شائع کی تھی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ سے سردار جعفری کی آخری کتاب "سرمایہ سخن" زیر اشاعت ہے، یہ غالباً وہ کام ہے جو انھوں نے نہرو فیلوشپ کے زمانے میں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۸ء کے بعد کی نظموں کا مجموعہ بھی آنا چاہیے اور کلیات نظم کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ علی سردار جعفری ہمارے ان شاعروں اور ادیبوں میں سے تھے جن کی وجہ سے اردو کا سر ہندستان کی ادبی محفلوں میں اونچا تھا۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر نہ ہوگا۔ افسوس:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

□□□

جشن جمہوریت کے موقع پر لال قلعہ میں منعقدہ مشاعرے کی شمع روشن کرتے ہوئے جناب علی سردار جعفری ساتھ میں ہیں
جناب صاحب سنگھ، جناب سکندر بخت اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

www.taemeernews.com

مجموعۂ صد صفات اِک ذات

مخمور سعیدی

○

رہ رہ کے جو یاد آرہا ہے
وہ شخص کہاں چلا گیا ہے
آنکھیں، کہ اسی کی منتظر ہیں
دل ہے ، کہ اسی کو ڈھونڈتا ہے
ہیں شام و سحر طلب میں اس کی
ہر لمحہ اسے پکارتا ہے
ہیں فرش و فلک ملول جس پر
یہ سانحہ کیسا سانحہ ہے
غمناک ، جو لاکھ حادثوں سے
موت اس کی اک ایسا حادثہ ہے
شاعر بھی ، عزیز شاعراں بھی
کیوں ہم سے جدا وہ ہوگیا ہے
نقاد ، ادیب اور محقق
کیا کہیے تعارف اس کا کیا ہے
مجموعہ صد صفات ، اک ذات
ایسا کوئی اور کب ہوا ہے

○

انسان کو اس نے یہ بتایا
انسان کا احترام کیا ہے
اعجاز نما تھا اس کا لہجہ
شعلہ ، کبھی پھول بن گیا ہے
ہر جنبشِ خامۂ سخن میں
اک حشر نغمہ و نوا ہے
ہر شعر ہے شعر شور انگیز
ہنگامۂ فکر و فن بپا ہے
کلیوں کی چٹک میں اس کی آواز
پھولوں کی زباں سے بولتا ہے
کتنا شیریں ہے اس کا لہجہ
کانوں میں جو شہد گھولتا ہے

www.taemeernews.com

○

یادوں میں ہماری ہے وہ زندہ
خوابوں میں ہمارے جاگتا ہے
موجود اسی انجمن میں ہے وہ
سردار کہیں نہیں گیا ہے

○

یاد آتی ہیں اس کی کتنی باتیں
سناٹا سا دل پہ چھا گیا ہے
یہ بزم مشاعرہ ہے اور وہ
صدرِ بزم مشاعرہ ہے
یہ ایک مذاکرہ ہے اور ہال
تقریر سے اس کی گونجتا ہے
یہ ہاتھ میں اس کے جام مے ہے
جرعہ جرعہ وہ پی رہا ہے
یہ لالہ رُخوں کی انجمن میں
وہ قصۂ دل سنا رہا ہے
اسرار و رموز فکر و فن کے
ذہن و دل میں اتارتا ہے
اک کیفِ دوام کی فضا میں
وہ آج بھی سانس لے رہا ہے

○

نفرت تھی اسے اس اہرمن سے
انساں کا لہو جو چوستا ہے
دشمن تھا وہ اس نظامِ زر کا
جو آدمی خور اژدہا ہے
لیکن یہ خبر اسے نہیں تھی
وہ سائے میں جس کے جی رہا ہے
پیغمبر خیر وہ نہیں ہے
خود ایک بدی کا دیوتا ہے

○

مخمور صمیم قلب و جاں سے
اب اس کے لیے یہی دعا ہے
تا حشر سکون سے رہے وہ
تا عمر جو مضطرب رہا ہے
وہ اس سے سوا کا مستحق تھا
دنیا نے جو کچھ اسے دیا ہے

□□□

J-3/141-C کرشنا کنج اپکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی

www.taemeernews.com

سردار جعفری کی شاعری

پروفیسر شمیم حنفی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 110025

سردار جعفری کی شاعری پر ایک مضمون میں ان تمام مسئلوں پر اظہار خیال کرنا جن سے یہ شاعری عبارت ہے اور جو سردار جعفری کی حسیت اور اظہار کے تعین کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ مضمون کے مصنف اور قاری دونوں کے ذہن کو یہ بحث کسی نتیجہ خیز نقطے تک لے جاسکے، میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو بہتوں کی طرح میرے اندر بھی ایک شدید قسم کا ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔ یہ تو خیر ایک اچھی بات ہے، کیوں کہ جو شاعری پڑھنے والے میں کسی بامعنی ردِ عمل کو ہوا نہ دے سکے، وہ سنجیدہ غور و فکر کی متحمل بھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے جعفری اپنے ترقی پسند معاصرین مثلاً مخدوم اور مجاز اور فیض اور اپنے غیر ترقی پسند معاصرین مثلاً میراجی، راشد، مجید امجد اور اختر الایمان کی بہ نسبت میرے لیے زیادہ مشکل یوں ٹھہرتے ہیں کہ ان کی شاعری قدم قدم پر اصولی اور نظریاتی مباحث کے دروازے کھولتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ راشد، فیض، میراجی، مجید امجد اور اختر الایمان کے مقابلے میں بہت سہل الفہم اور غیر رسمی شاعرانہ حربوں سے خاصی حد تک آزاد ہونے کے باوجود، اور اس حقیقت کے باوجود بھی کہ جعفری کی نظموں میں ان کی حسیت کے ماخذ اور مراکز تک رسائی نسبتاً آسان بھی ہے جعفری کی شاعری سوالات بہت اٹھاتی ہے۔ ادب کی ماہیت اور ادیب کے مجموعی رول کی بابت جعفری نے اپنے تمام معاصرین سے زیادہ لکھا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے ان کا اپنا تخلیقی سرمایہ بھی شاید اپنے سبھی معروف ہمعصروں سے زیادہ ہے۔ اور کم سے کم اس معاملے میں تو شک اور قیاس کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ تخلیقی اور فکری سطح پر ہمارے زمانے کے پورے ادبی معاشرے کا احاطہ کرنے والے کچھ سوالوں اور بنیادی نوعیت رکھنے والے کچھ مباحث میں عملی شرکت کے اعتبار سے جعفری ہمیشہ دوسروں سے آگے رہے ہیں۔ اختلافات میں زیادہ الجھے ہیں۔ اشتعال آمیز باتیں زیادہ کہی ہیں۔ اور اپنے ایقانات کی طرح اپنے مفروضات کے سلسلے میں بھی ادعائی قسم کا رویہ زیادہ شدومد کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنے حلقے کے شارح اور مفسر بھی رہے ہیں۔ ایک سرگرم وکیل اور مبلغ بھی اور اس معاملے میں ان کا رویہ خاصا پُرجوش، پاس دارانہ اور جذباتی بھی رہا ہے۔

اسی لیے جعفری دوسروں کے مقابلے میں اعتراض اور مذمت کا نشانہ بھی زیادہ بنے۔ کم و بیش ہر چھوٹے بڑے نے، ترقی پسندی کی نظریاتی بنیادوں کو ہدف بنانے کا سب سے آسان راستہ یہی دریافت کیا کہ پہلے جعفری سے کچھ حساب کرلیا جائے۔ رول ماڈل سامنے ہو تو جدال پسندی ہوا میں ہاتھ چلانے کی بے معنی مشقت سے بچ جاتی ہے۔ یہاں اس واقعے کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ جعفری کے بعد کی نسل کا معمولی فرق کے ساتھ، جعفری کے ساتھ وہی سلوک رہا ہے جیسے جعفری نے اپنے پیش روؤں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ زیادتی کے مرتکب دونوں ہوئے ہیں۔ مگر سردار جعفری کی ادبی زندگی کے اولین دور سے وابستہ رویوں نے ان کے بارے میں کچھ سنگین قسم کی غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے نتیجے میں سردار جعفری کی شاعری کو ابھی تک اس کے حقیقی تناظر میں رکھ کر دیکھا نہیں جاسکا۔ اس طرح کی اکا دکا کوشش ہوئی تھی تو

www.taemeernews.com

جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش میں گم ہو گئی۔

میراجی نے منتخب نظموں (۱۹۴۱) کے دیباچے میں لکھا تھا:

"صحیح اور صحت مندانہ ترقی پسندی، مختصر لفظوں میں خیال افروزی کا دوسرا نام ہے۔ جو اب خیال افروز ہوگا، وہ زندگی کے بہ شعبے میں ہمیں ایک قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دے گا"۔

میراجی کی اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے محمد صفدر نے اپنے مضمون (بے راہ روی کی ضرورت) میں راشد، فیض، جعفری اور ان کے بعد کی نسل کے بعض شعرا کے حوالے سے یہ رائے قائم کی تھی کہ یہ شاعری ایک طرف تو اقبال کی مابعد الطبیعات کے خلاف ہے دوسری طرف اس بے یقینی کی کیفیت کے خلاف جو جدید تر شاعری میں انفرادیت، تنہائی اور تشنج کے طور پر نمودار ہوئی ہے۔ خود جعفری نے اقبال کی مابعد الطبیعات سے کنارہ کشی کا جو رویہ شروع میں اختیار کیا تھا، اس سے بہ ظاہر یہی گمان ہوتا تھا کہ اردو کی بنیادی شعری روایت اور اقبال کے مجموعی نظام فکر سے الگ وہ کسی تیسری جہت کی تلاش میں ہیں۔ جہاں تک اقبال کے مابعد الطبیعات اور نئی نسل کی بے یقینی سے اختلاف کا تعلق ہے، یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ جعفری اور ان کے ترقی پسند معاصرین، بہر حال ایک واضح تخلیقی نصب العین اور ایک معینہ نظام فکر میں یقین رکھتے ہیں جو نہ تو اقبال کی شاعری سے مناسبت رکھتا ہے نہ نئی نسل کے مزاج سے۔ لیکن اقبال کی مابعد الطبیعات سے عدم مطابقت کو اقبال کی روایت سے انکار کے طور پر دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ اب آیئے نئی نسل اور جعفری کے سوال پر گفتگو کے ترقی پسند ادب نمبر (۱۹۷۹ء) میں تخلیق کی نئی سمت کے عنوان سے جعفری نے اس عہد کی ادبی صورت حال کا ذکر یوں کیا ہے کہ:

"اس وقت ادب میں دو آوازیں ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک آواز کا موضوع تہذیب کی نشاۃ الثانیہ ہے اور اس کا محور اور مرکز انسان ہے جو تاریخ میں پہلی بار عالم گیر پیمانے پر آزادی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ صرف معاشی اور سیاسی آزادی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی آزادی بھی ہے، جو انسان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے۔ دوسری آواز کا موضوع تہذیب کا زوال ہے اور اس میں انسان شکست خوردہ اور حقیر ہے، بے بس اور مجبور ہے، یقین کی روشنی سے محروم ہے اور نجات کے تصور سے بھی بے خبر۔"

گویا کہ پھر وہی بات کہ سردار جعفری کی شاعری (ترقی پسند شاعری) اپنی پیش رو روایت اور اپنے بعد کی روایت، دونوں سے الگ، شعور کے ایک تیسرے منطقے سے تعلق کی نشاندہی کرتی ہے۔ فتح محمد ملک نے نئی شاعری اور جدید شاعری کی شناخت کا تعین کرتے ہوئے اس بات کی شکایت کی تھی کہ فیض اور سردار جعفری کو ترقی پسندی کے نمائندہ شاعر کی حیثیت اسی لیے حاصل ہوئی کہ یہ دونوں 'اقبال کے پھیلتے ہوئے اثرات کی راہ میں فکری سطح پر حائل ہوئے اور اقبال سے یکسر الگ ہو کر اپنی بوطیقا مرتب کی۔ ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس میں اقبال کی عدم شرکت کے واقعے کو فتح محمد ملک نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس کی ادبی سیاست، روایت اور ترقی پسندی کی آویزش کے حوالے سے یہ سمت دینے کی کوشش کی ہے کہ چوں کہ اقبال نے بین الاقوامی صورت حال کا مطالعہ ایک خاص مشرقی اندازِ نظر کے ساتھ کیا تھا اس لیے وہ اپنے بعد کی نسل کے لیے قابلِ قبول نہ ہو سکے۔ دوسری طرف (عجیب بات ہے کہ) وہ اقبال کو "بین الاقوامی ادبی فضا میں سانس لینے والے" اور "پھیلتے ہوئے اثرات" کے شاعر کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں۔

یہاں سردار جعفری کی شاعری اور ان کی حسیت سے مربوط کچھ مسئلوں کے جائزے میں اقبال کا تذکرہ میں نے ایک خاص مقصد اور مجبوری کے تحت کیا ہے۔ بادی النظر میں جعفری کے شعری رویے اور ان کا فکری مزاج اقبال سے کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتا۔ اقبال کے تہذیبی تصورات اور ان کی شعریات کے بارے میں جعفری نے اپنی ابتدائی تحریروں میں جن باتوں پر زور دیا ہے ان سے بھی یہی تاثر ابھرتا ہے کہ جعفری کی شاعری کے عناصر اور سرچشمے اقبال سے یکسر لاتعلق ہیں اور ان کی تخلیقی اور فکری اساس بالکل مختلف ہے۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ جعفری کی

www.taemeernews.com

شاعری کے خلاف جو گہرا تعصب ہمیں نئی تنقید میں عام دکھائی دیتا ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ شروع سے اب تک جعفری کی شاعری کو اس کے صحیح سیاق میں رکھ کر دیکھا نہیں جا سکا۔ ایک عام مفروضہ یہ قائم کر لیا گیا کہ جعفری کی شاعری (ترقی پسند شاعری) اپنی روایت سے تصادم اور ایک شدید قسم کی نظریاتی کشمکش، ایک طویل فکری فاصلے، ایک مختلف شعریات کا پتہ دیتی ہے۔ یہ مفروضہ حقیقت کے کے بجائے صرف ایک تاثر پر مبنی ہے اور اس تاثر کی تشکیل میں خود جعفری بھی اپنے معترضین سے کم سرگرم نہیں رہے ہیں۔ جعفری کی نثر نے ان کی شاعرانہ حیثیت کے خلاف خاصی گرد اڑائی ہے۔

ترقی پسند شاعروں سے قطع نظر، اپنے غیر ترقی پسند، ہمعصروں کے مقابلے مں بھی جعفری نے نثر میں اپنے موقف کی وضاحت کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ ترقی پسند ادب پر ان کی کتاب کے علاوہ ان کے مضامین، اداریے، بحثیں، مقدمات، ان کی اپنی شاعری کے جواز اور پس منظر کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ جعفری کی شاعری کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں یہ سوال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شاعری کے تخلیقی مفہوم اور مرتبے کا تعین خود جعفری کے نثری بیانات اور وضاحتوں کی مدد سے کیا جانا چاہیے؟۔ میرا اپنا جواب نفی میں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جعفری کی شاعری کا حقیقی سیاق شعریات کے جن اصولوں، ہماری اپنی روایت کے جن اوصاف اور ہمارے معاشرتی نظام سے مربوط جن قدروں کی روشنی میں متعین کیا جانا چاہیے تھا، ہمارے زمانے کی حسیت نے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی اور خود جعفری نے ان اصولوں، قدروں اور اوصاف کو قبول کرنے کے باوجود ان سے زیادہ زور نظریاتی مباحث کی وضاحت پر صرف کیا۔ اپنی مرکزی شعری روایت سے جو رشتہ جعفری کا ہے، وہ راشد، فیض، مخدوم، میراجی، مجید امجد، اخترالایمان میں سے کسی کا نہیں ہے۔ اور اقبال سے اپنی ارادت کا بہت موثر اظہار (اقبال پر اپنی نظم میں) کرنے کے باوجود، فیض کی حسیت اور اقبال کی حسیت میں اشتراک کے اتنے پہلو نہیں نکلتے جتنے کہ اقبال کے تصورات سے جارحانہ اختلافات رکھنے کے باوجود، جعفری کے تخلیقی مزاج اور ان کی شاعری کے مجموعی نظام سے نکلتے ہیں۔

آزادی کے بعد کی اردو نظم سے متعلق اپنے ایک مضمون میں وحید اختر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ نئی نظم کے اسالیب اور مزاج کی تشکیل میں دو روایتیں، دوسرے تمام مآخذ اور سرچشموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ایک کا سلسلہ میراجی تک جاتا ہے، دوسری کا سردار جعفری تک۔ وحید اختر کا خیال تھا کہ تجربہ پسندی اور ہیئت پرستی کے حصار شوق سے باہر کی نئی نظم، جس کے واسطے سے نئے طرز احساس کی فکری بنیادوں تک پہنچا جا سکتا ہے، وہ سردار جعفری کی قائم کردہ روایت سے مربوط ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ نئی نظم کو فکری اساس مہیا کرنے والے تمام قابل ذکر شاعروں راشد، فیض، میراجی، اخترالایمان اور مجید امجد کے برعکس جعفری کی شاعری نے بین الاقوامی تصورات اور تجربوں سے متاثر ہونے کے بعد بھی اپنی مشرقیت کو بچائے رکھا۔ شاعروں کی اس صف سے (شاید) ایک اکیلی آواز جو آزاد نظم کی قبولیت سے انکار میں اٹھی، وہ سردار جعفری کی تھی۔ جعفری بھی سجاد ظہیر کی طرح آزاد نظم کو انحطاطی میلانات کی پروردہ سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) کی نظموں میں آزاد نظم کے اسی اسلوب کو ایک نیا تخلیقی اعتبار ملا۔ ۱۹۳۶ء تک، جس وقت جعفری نے آزاد نظم کے خلاف آواز اٹھائی، وہ سمجھتے تھے کہ "بعض نوجوان (روایت کی پاس داری کو بے جا قیود کا نام دے کر) بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں، ایسی چیزیں پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں (مضمون اردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات، علی گڑھ میگزین، ۱۹۳۶ء) اس رائے کی شدت پسندی میں کچھ حصہ جوانی کے جوش کا بھی ہوگا۔ علاوہ ازیں، لارنس کا یہ خیال کہ لوگ تجربوں سے ڈرتے ہیں اور نامانوس غذا کی طرح نامانوس خیال کو قبول کرنے میں بھی وقت لگتا ہے، اس واقعے پر بھی صادق آتا ہے۔ بہرنوع، جعفری کے تخلیقی سفر میں اس واقعے کی حیثیت محض ضمنی ہے اور اس کی بنیاد پر ادب کے معاملے میں ان کی قوت

www.taemeernews.com

فیصلہ کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ اس کے برعکس، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ نئے تجربوں سے جہاں ڈرتے رہنا اچھا نہیں، وہیں ہر نئے تجربے کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لینا بھی تعریف کے قابل نہیں ہے۔ مزید برآں، جیسا کہ اس بحث کے شروع میں عرض کیا گیا، جعفری اپنی روایت کی پہچان کے معاملے میں اپنے تمام ممتاز معاصر نظم گویوں ــــ راشد، فیض، اختر الایمان، مجید امجد، میراجی سے آگے ہیں۔ کلاسیکیت سے ان کا روز افزوں شغف، اقبال کی طرف ان کی مراجعت انھیں دراصل اس سلسلے کا شاعر بناتی ہے جو جوش، اقبال، اکبر سے ہوتا ہوا حالی تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلے کے پس منظر میں اردو مثنوی، مرثیے اور ایک حد تک غزل کی روایت بھی پھیلی ہوئی ہے۔

اپنے تہذیبی اور معاشرتی شعور کو ذی کولو نائز (DECOLONIZE) کرنے کا چلن ابھی کل کی بات ہے۔ بصورتِ دیگر صرف انگریزی صندوقوں میں علم کے خزانوں کو دریافت کرنا اور اپنے اجتماعی ورثے اور اپنے نسلی حافظے کی ہنسی اڑانا، ایک عام واقعہ تھا جس سے ہمیں کچھ فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن جس کے باعث ہم نے نقصان بہت اٹھایا۔ مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ اردو کی مرکزی شعری روایت سے مربوط ان سب شاعروں کو جن کا سایہ اردو کی جدید / نئی نظم کے پس منظر میں ایک حد تک دھندلا چکا ہے، (اختر الایمان، حفیظ، جوش وغیرہ) انھیں تخلیقی لحاظ سے پس ماندہ کہوں اور ان کے نام قلم زد کر دوں۔ ہم جنھیں دوسرے درجے کا شاعر سمجھتے ہیں، انھوں نے کسی نئی روایت کی بنیاد چاہے نہ ڈالی ہو، لیکن اپنی روایت کے تحفظ اور تسلسل کا فریضہ بہ قول ایلیٹ یہی MAJOR- MINOR شعرا انجام دیتے ہیں۔ جعفری کے فنی شعور میں رفتہ رفتہ جو تبدیلی پیدا ہوئی اور جس کی شہادت ہمیں 'نئی دنیا کو سلام' (۱۹۴۸ء)، 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۰ء) اور 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) میں ملتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جعفری تک شاعری کے نئے اسالیب، اظہار کے نئے طریقے بتدریج روشن ہوئے، ایک تخلیقی رمز کے طور پر۔ اس معاملے میں ان کے یہاں کسی طرح کی عجلت پسندی نظر نہیں آتی۔ وہ نئے اسالیب کو قبول بھی کرتے ہیں تو اپنی روایت اور اپنے شعور میں پیوست مشرقیت کے ساتھ۔ چنانچہ نئی ہیئتوں اور اسالیب اظہار سے مانوس ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنے تہذیبی علائم، تمثالوں، شبیہوں، تلمیحوں اور صدیوں کے آزمودہ شعری وسیلوں سے اپنی دلچسپی ختم نہیں ہونے دی۔ مثال کے طور پر، محض وضاحتاً ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ نئی نظم کی بوطیقا میں خیال کے تدریجی ارتقا، نظم کی نامیاتی وحدت، تجربے کی کلیت کے تصور پر اس طرح اصرار کیا گیا کہ اس تصور نے ایک شعری قانون کی حیثیت اختیار کر لی۔ مغربی معیاروں کے مارے ہوئے ایک نقاد (کلیم الدین احمد) نے اقبال کی شاہکار نظموں میں بھی یہ نقص ڈھونڈ نکالا کہ ان نظموں سے بند کے بند حذف کر دیجیے جب بھی نظم کی ترکیب میں فرق نہیں آئے گا اور پڑھنے والے کو ادھورے پن کا ذرا بھی احساس نہیں ہوگا۔ ایک بنیادی سچائی جو بھلا دی گئی یہ تھی کہ نئے تخلیقی تجربے، وقت کی تبدیلی اور روایت کے ارتقا کے ساتھ، لازماً پرانے تجربوں کا متبادل نہیں بنتے، یا انھیں REPLACE نہیں کرتے۔ ضروری نہیں کہ ہر نئے خیال کو اختیار کرنے سے پہلے آپ پرانے خیال سے دستبردار ہو جائیں۔ انسانی شعور اور احساسات کی سرزمین پر نئے تجربوں کے لیے جگہیں اس طرح نہیں بنائی جاتیں۔ نیا زمانہ کبھی کبھی پرانے نظام میں شامل اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کسی طرح کے شور شرابے اور توڑ پھوڑ کے بغیر اس کے لیے گنجائش نکال لی جاتی ہے۔ کچھ پانے کے لیے، ادب اور آرٹ کی روایت میں کچھ کھونے کی شرط ضروری نہیں۔ خیر، یہ ایک الگ بحث ہے اور فی الوقت اس کی طرف بس اتنا اشارہ کافی ہے۔ جعفری کی شاعری کے حوالے سے، یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ اس منظر نامے میں نئے تجربوں کی دستک کے ساتھ ساتھ پرانے تجربوں کی سرگوشی بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ جعفری کے شعری طریقِ کار، طرزِ احساس، فنی مقاصد کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا نہیں۔ وہ شبیہ سازی کو، راشد کے برعکس، عیاشی نہیں سمجھتے۔ ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی روش سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ وہ اپنے آدرش تک نئی مغربی

www.taemeernews.com

تنقید، اور یورپ کے نئے ادبی میلانات کی مدد سے نہیں پہنچنا چاہتے۔ اپنی بری بھلی دنیا کو تیاگ کر نئی دنیا کا باسی بننے کی طلب نے ہمیں پچھلی دو صدیوں میں خاصا خراب اور رسوا کیا ہے۔ یہاں سردار جعفری کی نظموں سے مثالیں پیش کرنے اور اس سیدھے سادے نکتے کی وضاحت کے لیے ان نظموں کے فقیہانہ تجزیے کی ضرورت نہیں۔ جعفری کے دو ایک بیانات پر نظر ڈالنا کافی ہوگا۔ مثلاً:

"تکرار، ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت ہے۔ اردو غزل کی ہی مثال موجود ہے جس میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو دہرایا ہوگا۔"

(افکار، کراچی: سردار جعفری نمبر)

"نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے، اور خاص طور سے یورپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر، وہ میری تربیت نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعرا کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ میرابائی بھی ہے، رومی بھی ہیں، حافظ بھی ہیں... میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لیے معیار بنا سکوں۔ تلاش کر سکوں، اپنی شاعری کی تربیت کے لیے۔"

(حوالہ: ایضاً)

اپنی اسی بات چیت میں، جہاں سے یہ دو اقتباس لیے گئے، جعفری نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا تھا کہ "کسی شاعر کے رتبے کا تعین مرچہ اس کی اعلیٰ درجے کی شاعری سے ہوتا ہے" لیکن، اسی شاعر کے یہاں ایک حصہ "ضرورت والی شاعری" کا بھی ہوتا ہے۔ "وہی دریا ہے مگر اس دریا میں کہیں تنکے بھی بہہ رہے ہیں اور کہیں گلاب بھی"۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جعفری نے اپنی ترجیحات کے علاوہ، اپنے حدود کی نشاندہی بھی کی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ واضح طور پر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ جعفری کی شاعری کا تانا بانا زمانے کے رنگ کی بجائے، ان کی اپنی امنگ کا تیار کردہ ہے۔ اپنی روایت سے ان کے رابطے محض علمی نہیں ہیں۔ یہ روایت اپنے آپ کو دریافت کرنے، اپنے معیار قائم کرنے اور اپنے شعور کی تربیت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ فارسی کی شعری روایت سے استفادے میں جعفری نے ہر چند کہ سبک ہندی کے شاعروں سے شاید سروکار نہیں رکھا یا بہت کم رکھا۔ کبیر، اور حافظ، میر، غالب، اقبال کی طرف بھی وہ جاتے ہیں تو اس طرح کہ ان کا اپنا ایجنڈا ساتھ رہتا ہے اور اسی ایجنڈے کے مطابق وہ اپنا رشتہ اپنے ماضی سے استوار کرتے ہیں۔ لیکن ایک اہم نکتہ جو رد و قبول کے اس پورے عمل سے رونما ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ اپنی اجتماعی تاریخ، اپنے ماضی اور روایت سے جعفری کا تعلق اپنے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند معاصرین کی بہ نسبت تمام حد بندیوں کے باوجود زیادہ وسیع ہے۔ میراجی، میرابائی تک صرف اپنی طبیعت کی عاشقانہ لہر کے واسطے سے پہنچے تھے اور فیض کے یہاں فارسی شاعری کی روایت کا اثر بس کچھ علائم اور استعارات، اظہار کے کچھ سانچوں کی دریافت تک ہے۔ فارسی کی روایت اور مجموعی طور پر اردو شاعری کے تہذیبی ماضی سے جعفری کا رشتہ، راشد کے فارسی آمیز لہجے اور مغربی استعمار کے خلاف ان کے فکری جہاد اور اس کے عجمی سیاق کے باوجود، زیادہ بامعنی ہے اور زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے۔ بہ قول میراجی، راشد طبیعتاً مغربی محاورے کے شاعر تھے۔ (میراجی: اس نظم میں) غزل کی طرف اپنے مغائرت کے رویے کی وجہ سے اخترالایمان نے اپنی روایت اور اپنی حسیت کے مابین خود ہی ایک حد قائم کرلی تھی۔ یوں بھی، میراجی، راشد، فیض، مجید امجد اور اخترالایمان کا شعور کچھ تو اردو کے لسانی مراکز سے دوری اور جذباتی لاتعلقی کے باعث اور کچھ اردو کی مرکزی روایت سے بے رغبتی کے باعث اپنے ماضی میں اچھی طرح پیوست نہیں ہو سکا۔ سردار جعفری اپنی تمام تر ترقی پسندی کے باوجود کلاسیکی مزاج کے شاعر ہیں اور گو کہ زیادہ شوق کے ساتھ انھوں نے نظم کی صنف اختیار کی، مگر غزل کی روایت کو انھوں نے کبھی مسترد نہیں کیا اور اس کے اثر سے ان کی نظم عموماً نکل نہیں سکی۔ یہ جعفری کے اپنے جمالیاتی انتخاب کا نتیجہ بھی ہے، کسی طرح کی نفسیاتی مجبوری نہیں۔ اس سے یہ

www.taemeernews.com

بھی معلوم ہوتا ہے کہ جعفری مشرقی طرزِ احساس اور تفکر کے امتیازی اوصاف سے کس طرح اور کیوں کام لیتے ہیں:

"ہم آج بھی حافظ شیرازی کی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور ہماری تمام غزلوں میں الفاظ کا ایک سیٹ (SET) ہے، کوئی پانچ سو الفاظ کا۔ انھیں سے ہم بڑے مفاہیم پیدا کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ ایک استعارہ بن گیا ہے۔"

(افکار، کراچی: سردار جعفری نمبر، گفتگو بند نہ ہو)

"غزل سب سے زیادہ نیچرل فارم ہے شاعری کا... لیکن اچھے شاعر کے یہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا۔"

(حوالہ: ایضاً)

ظاہر ہے کہ اس انداز فکر کے مضمرات صرف لسانی نہیں ہیں۔ اس کے پیچھے زندگی کی طرف مشرق کے مجموعی رویے، مشرقی وجدان میں لچک اور وسعت کے اوصاف کی آگہی بھی موجود ہے۔ مغربی اقوام کی پیدا کردہ ذہنی بیداری کے سیلاب میں، ہماری اجتماعی سرشت کے ساتھ ساتھ یہ پیش آیا کہ ہمیں یہ توازن برقرار نہ رہ سکا کہ بہ قول ملارمے شاعری میں تشبیہ کا استعمال ایک مہلک شے ہے اور اسے شعری قواعد کے دائرے سے خارج کر دینا چاہیے۔ لیکن یہ بات ہم نے بھلا دی کہ کالی داس کو اُپما سمراٹ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور یہ کہ کلاسیکی عربی اور فارسی شاعری کے محاسن کی کوئی فہرست تشبیہ سازی اور قافیہ پیمائی کے تذکرے سے خالی نہیں ہوگی۔ جوش کی شاعری کے بارے میں جعفری کی رائے مبالغہ آمیز اور جوش کے شعری ضابطوں میں جعفری کے یقین کی نوعیت قدرے جذباتی بھی ہو سکتی ہے، مگر ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ سلیم احمد نے (ترقی پسندی کے شدید ذہنی مغائرت کے ہوتے ہوئے بھی) جوش کو جوشِ اعظم کیوں کہا تھا۔

اسی طرح بیان کی پیچیدگی اور خیال یا تجربے کی پیچیدگی کو نئی شعریات کی ترویج و تفہیم میں کچھ ایسی قبولیت ملی کہ ہمارے تخلیقی وجدان اور ادبی مذاق کے محور ہی بدل گئے۔ نئے تجربوں، اظہار کے طریقوں، آرٹ اور ادب کی دنیا میں ہونے والی عالم گیر تبدیلیوں، نئے رویوں سے روشناس ہونا اور اپنی روحانی احتیاج کے اور ذوق کے تقاضوں کی روشنی میں انھیں اختیار کرنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن یہ کیا کہ ہم ذہنی بیداری اور ترقی کے نام پر بڑے ادب، معنی خیز اور سچے ادب کی بابت اپنے تمام سابقہ تصورات سے بیک قلم منحرف ہو جائیں۔ ادب اور تہذیب کے ایام جاہلیت، بہت بار آور تخلیقی روشنی اور فیضان کے دن بھی ہو سکتے ہیں۔ دنیا بھر کے اعلا ادب کا قابلِ لحاظ حصہ زندگی کے عام اور مانوس تجربوں اور اظہار کے سہل ترین اسالیب کا گواہ ہے۔ جعفری نے عمومیت زدگی کے خطرے اپنی طویل نظموں میں خاصے بڑے فکری کینوس پر مول لیے ہیں۔ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ اظہار کی روایتی تقسیم، تخلیقی زبان اور کاروباری زبان کی درجہ بندی کے سلسلے میں ہمارے رویے بالعموم ناقص اور غلط قسم کے مفروضات پر مبنی ہیں۔ اپنے معاصرین میں جعفری کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اقبال کے بعد وہ پہلے شاعر ہیں، جس نے ایک تبدیلیوں سے دوچار اور پیچیدہ جذباتی، فکری، سیاسی، معاشرتی حالات سے بوجھل زمانے میں اپنی شاعری سے تخلیقی مقالہ نویسی (CREATIVE DISSERTATION) کا کام لیا۔ نئی دنیا کو سلام (۱۹۴۸ء) امن کا ستارہ (۱۹۵۰ء) ایشیا جاگ اٹھا (۱۹۵۰ء) شاعری کے پیرائے میں ہمارے پُر جلال اور مہیب مسئلوں کا احاطہ کرنے والی ڈوکیومنٹریز ہیں۔ پہلی عالم جنگ کے بعد کی انسانی صورتِ حال نے سیاسی، تہذیبی، تخلیقی سطح پر دہشت، انتشار، اجتماعی دیوانگی اور آشوب کا جو راستہ اپنایا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ بڑے کینوس پر اس صورتِ حال کی تصویر مرتب کی جائے۔ ایلیٹ کی THE WASTE LAND (۱۹۲۲ء) کے پیمانے پر۔ ایلیٹ ہی کے لفظوں WIDEST POSSIBLE VARIATION OF INTENSITY (شدتِ احساس کے وسیع ترین ممکنہ تغیرات اور صورتوں) کے اظہار کی گنجائش اسی طرح پیدا کی جا سکتی تھی۔ ایک ساتھ بہت کچھ کہنے کے لیے تخلیق کے شعلے کو بھڑک کر

www.taemeernews.com

ٹھنڈے پڑ جانے سے بچانا ضروری ہے۔ جعفری نے اپنی طویل نظموں میں جو اسلوبیاتی روش اختیار کی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ تمثیل نگاری، مصوری، موسیقی اور تفکر کے عمل کو باہم ملانے اور ایک صبر آزما اور طویل تخلیقی مہم کو سر کرنے کی تیاری میں ادب اور صحافت کی سرحدوں کو ساتھ ساتھ عبور کرنے کی کوشش نے ان نظموں میں تخلیقی تجربے کی ایک نئی سطح دریافت کی ہے۔ طرح طرح کے لفظوں، لکیروں، بیٹوں، رنگوں اور شبیہوں کی بھیڑ، پھر شور اور سرگوشی، ساز اور رقص، سکوت اور تحرک کی مشترکہ سرگرمی نے ان نظموں کو ایک مہیب میورل کی شکل دے دی ہے۔ گویا کہ صرف سخنِ مختصر یا ایک شعلۂ مستعجل کی مدد سے یہ سفر طے ہونے کا نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس مضمون کے اختتام کا یہ مناسب موقعہ ہے اور مجھے ایک شخصی اعتراف کے ساتھ اپنی بات اب سمیٹ دینی چاہیے۔ جعفری کے بارے میں اور خود جعفری سے گفتگو کے موضوعات کثیر ہیں۔ میں کثرتِ نظارہ کا شیدائی ہوں۔ یک رنگی مجھے بہت جلد تھکا دیتی ہے۔ ہمارے زمانے کے ترقی پسندوں میں نئی نسل کا مکالمہ سب سے زیادہ جعفری کے ساتھ رہا۔ اتفاق، اختلاف، محبتیں، شکایتیں اور تہمتیں، یک جہتی اور برگشتگی، کون سی ایسی کیفیت ہے جس کے تجربے سے اس مکالمے کے دوران ہم نہیں گزرے۔ ایک ایسے برق رفتار اور ہزار شیوہ زمانے میں، جب ایک دوسرے کے لیے غیر دلچسپ ہونے میں ہمیں دیر نہیں لگتی، آئے دن زندگی کے اور فکر کے طریقے بدلتے رہتے ہیں اور کچے خیال خام مال کی طرح ہم درآمد کرتے رہتے ہیں، جعفری کی سدابہار شخصیت اپنی مختلف الجہات شاعری، اپنی دل نشیں اور توانا نثر، اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی تخلیقی جستجو اور سرگرمی کے مختلف دائروں، اپنے فکری تنوع اور پھیلاؤ، اپنی تجربہ پسندی اور اپنے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ، ہمارے لیے آج بھی تازہ کار اور پرکشش ہے۔ جعفری کے وضع کردہ معیاروں اور ہمارے معیاروں میں عدم مفاہمت اور اختلاف کی صورتیں بھی موجود ہیں اور ان کے تمام فیصلوں کو ہم قبول نہیں کرتے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان جیسا کوئی اور نہیں۔ ہمارے تہذیبی ماضی، ہماری روایت، ہمارے آج کی حسیت اور ذہنی و جذباتی ماحول تک رسائی اور ان سب کے تشخص کا ایک بہت موثر وسیلہ جعفری کی شخصیت ہے۔ صرف ہم خیالوں کے ساتھ زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی!

□□□

ترقی پسند تحریک کی تین نمایاں شخصیات: غلام ربانی تاباں، حیات اللہ انصاری اور علی سردار جعفری

www.taemeernews.com

ہندوستانی ادب میں تخلیقی لین دین اور سردار جعفری کی شاعری

پروفیسر عبدالستار دلوی
3۔ البلال، باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی 400050

مختلف ہندوستانی زبانوں میں تخلیقی سطح پر لین دین نہ صرف مختلف ہندوستانی ادبیات سے فکری اور فنی اعتبار سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ آپسی افہام و تفہیم کے لئے ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ اس میں ہمارے ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر سیاسی جنون، نفرت، احیا پرستی، شدت پسندی، استعماریت اور فاشزم کے خلاف اعلانِ جنگ بھی ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں تخلیقی لین دین آج کے سیاسی اور سماجی حالات میں، وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس تخلیقی لین دین کی روایتیں اردو زبان وادب میں قدیم ہیں۔ اردو زبان وادب ہندوستانی سرزمین کا، اس کی خوشبو کا، اس کے رسم و رواج کا اور اس کے تہذیب و تمدن کا دل کش آئینہ ہے۔ امتزاج، اختلاط اور ارتباط اردو زبان و ادب کی بنیاد ہیں۔ ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے مختلف مظاہر، یہاں کے پھل پھول، دل کش نظارے، موسم، کھیت اور کھلیان، ندیاں اور پہاڑ اور مذہبی و تاریخی شخصیات مثلاً رام، کرشن، لچھمن، بدھ، کالی داس، گرونانک اور مختلف تہوار مثلاً ہولی، دیوالی، بسنت، عید، بقر عید وغیرہ اس زبان وادب کا جز ہیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری اور ادبی خدمات اس تخلیقی لین دین کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ سردار جعفری اس تخلیقی اور تہذیبی لین دین کی ایک علامت بن گئے ہیں۔ ان کے افکار چاہے ان کا اظہار شاعری میں ہوا ہو یا نثر میں یا ان کی تقاریر میں ان کے پیش نظر یہی بنیادی مقصد رہا ہے کہ زبان و ادب کو اظہارِ محبت، دوستی و یگانگت، بھائی چارہ اور انسان دوستی کے اظہار کا وسیلہ بنایا جائے۔ ان کے شعری و نثری کارنامے اولاً ملک و قوم کے اتحاد، بھائی چارہ اور انصاف پسندی کو محدود جغرافیے میں جگانے کا کام کرتے رہے، پھر انھوں نے براعظم ایشیا کو استعماری طاقتوں کے خلاف للکارا اور اپنی مشہور نظم "ایشیا جاگ اٹھا" لکھی جس کی تہہ میں عالمی برادری، محبت، عزت و احترام اور انسان دوستی اور بقول اقبال "احترامِ آدم" کو اپنے فکر اور فن کا موضوع بنایا۔

مختلف ہندوستانی زبانوں میں تخلیقی لین دین سے ہم ایک دوسرے کو سمجھنے، پرکھنے، فکر و خیال میں ہم آہنگی پیدا کرنے، نفرت کی دیواروں کو گرانے، شدت پسندی کو ختم یا کم کرنے میں مدد لے سکتے ہیں اور اس لحاظ سے ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں مختلف مذاہب ہیں، جہاں مختلف تہذیبیں ہیں، جہاں بے شمار زبانیں ہیں، ان تمام مذاہب، تہذیبوں اور زبانوں کے درمیان اس تخلیقی لین دین سے غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں اور مغائرت کو دور کیا جا سکتا ہے۔ زبان وادب ایک طاقتور وسیلۂ اظہار ہے اگرچہ کسی شاعر یا ادیب کو جو بنیادی طور پر فنکار ہوتا ہے کسی اصول و ضوابط اور موضوع کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے رہنمایانہ اصول وضع نہیں کئے جا سکتے، تاہم اس سے سماجی آگہی اور ضرورتِ زمانہ کے تحت امیدیں ضرور وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ شعر وادب کے سماجی تقاضے بھی ہوتے ہیں اور ان سماجی و عصری ضروریات کے لئے شعر وادب سے بہتر وسیلۂ اظہار ملنا مشکل ہے۔ اردو ادب اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ سیاسی اور سماجی حالات میں جہاں نفرتوں کی پرورش و پرستش کی جا رہی ہو، شاعر اور ادیب ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں، اگرچہ انھیں کوئی ہدایت نامہ نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ سماجی تقاضوں کو ضرور محسوس کرتے ہیں،

www.taemeernews.com

لہٰذا ان احساسات کو زبان عطا کرنا ان کا بنیادی منصب اور فرض ہے۔ ادب کے ذریعہ بھائی چارگی کو فروغ دیا جاسکتا ہے، عقل و شعور کو روشنی عطا کی جاسکتی ہے۔ ہمارے چند شر پسند مؤرخین اور سیاست دانوں نے اپنی طاقت اور مفاد کے لئے کتابوں اور ذہنوں کو آلودہ کر رکھا ہے اس زہر کو بنیاد بنا کر کبھی مسجد اور مندر کے نام پر لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کیا جاتا ہے، تو کبھی قدیم تہذیب یا پراچین سنسکرتی کے نام پر اور کبھی رام و رحیم کے نام پر لوگوں کو لڑانے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں، تو کبھی فنِ تعمیر کے عجائبات جیسے تاج محل کے نام پر تفرقے پھیلائے جاتے ہیں۔ کبھی شخصتوں کے بت تراشے جاتے ہیں اور ان کے نام پر خون کی ہولیاں کھیلی جاتی ہیں۔ ان تمام حالات اور مسائل کا ایک حل ہمارے شاعر اور ادیب اور دانشور ہیں، جنھیں علاقوں میں، مذہبوں میں اور زبانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ جو بنیادی طور پر وسیع تر تہذیبی اور سماجی و علمی ورثہ کا حصہ ہوتے ہیں۔ اب کالی داس ہوں یا بھرتری ہری، گیانیشور ہوں یا تکارام اور نام دیو، کبیر اور میرا بائی، یا تلسی و سورداس ہوں یا امیر خسرو، میر، غالب اور اقبال، سبرامنیاز بھارتی ہوں یا ملا ٹھول ہوں، سب ہندوستانی ادب کا حصہ ہیں جن کو اس کثیر لسانی ملک میں ترجموں کے ذریعہ ایک دوسرے سے متعارف کرانا ہمارا قومی فریضہ ہے، تاکہ مختلف پھولوں کی خوشبوؤں کو دوسروں تک پھیلایا جائے اور ان خوشبوؤں سے ہمارے اندر کی گھٹن کو سرسبزی اور شادابی میں بدل دیا جائے اور عطر بیز ہواؤں سے ہمارا ہندوستانی معاشرہ مہک اٹھے۔

زبانوں کے تعلق سے ہمارے ہاں گرمی زیادہ اور روشنی کم ہے، اپنی اپنی زبانوں کو فوقیت دیتے وقت لوگ اکثر زبان و ادب کے بنیادی رول کو بھول جاتے ہیں۔ زبانیں آپس میں وصل کے لئے استعمال ہوتی ہیں نہ کہ دوری یا فصل کے لئے، زبانوں کے اس بنیادی کردار کو آپسی افہام و تفہیم کے لئے تخلیقی لین دین سے مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے یہاں انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا روسی زبانوں کے سلسلے میں لوگ دلچسپی لیتے ہیں اور یہ بہت اچھی بات ہے، لیکن وہ عام طور سے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ملک کی، پاس پڑوس کی زبانیں اور ان کا ادب بھی یورپی زبانوں اور ادب کی طرح فنی، فکری اور جمالیاتی لحاظ سے بہت مالدار ہے، ان میں ہمارا مشترکہ فکری، تہذیبی اور جمالیاتی ورثہ اور احساس ہے جو صدیوں سے ایک دوسرے سے متاثر ہوتی اور متاثر کرتی رہی ہیں، چنانچہ اس کا ادراک بھی ضروری ہے تاکہ اس ادراک سے ہماری متحدہ قومیت کی بنیادوں کو طاقت اور توانائی حاصل ہو، ہمارے تاریخی، تہذیبی، مذہبی اور جمالیاتی حوالوں اور علامتوں کو سمجھا جاسکے جو ہماری مشترکہ قومی تہذیب (COMPOSITE NATIONAL CULTURE) کا حصہ ہیں، ہمارے ملک کا ETHOS دوستی، محبت، رواداری اور اتحاد کا ETHOS ہے، اسے ہم زبانوں کی لین دین یا آدان پردان سے سمجھ سکتے ہیں اور جس کی بنیادیں موجود ہیں۔ اردو میں ویدوں، اپنشدوں، رامائن اور مہابھارت اور گیتا کے بیشمار ترجمے موجود ہیں، سنسکرت کے اہم فن پاروں مثلاً کالی داس کے ڈراموں کے اردو تراجم بھی ہوئے ہیں، میں دوسری زبانوں سے تراجم کی بات نہیں کروں گا، مگر ریاست مہاراشٹر اور مراٹھی کے حوالے سے یہ ضرور کہوں گا کہ مراٹھی کے سنت شاعر رام داس کی مشہور زمانہ "مناچے شلوک" کا ترجمہ ۱۷۵۰ء کے قریب ایک صوفی بزرگ شاہ تراب چشتی نے کیا تھا۔ ۱۸۱۸ء میں حیدر بخش حیدری کی مشہور تصنیف آرائش محفل، جو فورٹ ولیم کالج کی ایک اہم یادگار ہے، اس کا ترجمہ "سنجار نجنی" کے نام سے ہوا تھا اور پھر ۱۸۹۳ء میں مراٹھی زبان کی مشہور آنندی بائی جوشی کی خود نوشت کا ترجمہ احمد علی شوق نے کیا تھا۔ یہ سارے تراجم کسی سیاسی مصلحت، عصری اور سماجی ضرورت یا زور زبردستی کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ اعلیٰ ادب کے مطالعہ کی خواہش اور جذبہ کی دین تھے، آج کے مخصوص سیاسی، سماجی اور عصری تقاضوں کے تحت بھی اگر ہم یہ کام کریں تو اس کی افادیت بہرحال قائم رہتی ہے اور ہم سب کی توجہ چاہتی ہے۔

اس اہم ادبی اور تہذیبی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا، علی سردار جعفری صاحب جو بنیادی طور پر ایک ممتاز شاعر،

www.taemeernews.com

ادیب اور دانشور تھے، انھوں نے ادبی لین دین کے اس عمل کو اردو اور ہندی میں ایک وقار کے ساتھ روشناس کرایا، اس سلسلے میں سنسکرت ادب کے جستہ جستہ حصوں کے اور بطور خاص کالیداس کی منظومات کو اردو کے شعری پیکروں میں ڈھال دیا، مگر اس سمت میں ان کا پہلا کام مشہور چارلس اور لیمب کی شیکسپیئر کی کہانیوں کے اردو تراجم ہیں جنھیں مارچ ۱۹۵۱ء میں کتب پبلیشر لمیٹیڈ نے شائع کیا، جن میں طوفان، آرلینڈو اور ایلینڈ، وینس کا سوداگر، بادشاہ لیئر اور ہملٹ، ڈنمارک کا شہزادہ شامل ہیں۔ اس کے بعد جعفری صاحب کے دوسرے اہم کام ہندی اور اردو کے کلاسیکی ادب کو ناگری اور اردو رسم الخط میں پیش کرنا تھا، اس اہم کام کی ابتدا جعفری صاحب نے "دیوان غالب" کی ترتیب سے کی، انھوں نے دیوان غالب کو اپنے عالمانہ اور فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ اردو اور ہندی میں ۱۹۵۸ء میں مرتب کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن غالب کی دو صد سالہ سالگرہ کے موقع پر گزشتہ ماہ شائع ہوا ہے۔ دیوانِ غالب کے بعد دیوانِ میر کو بھی اسی طرح جعفری صاحب نے اردو اور ناگری میں شائع کیا تاکہ اس خدائے سخن کو غیر اردو داں بھی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ جس طرح اردو کے شہ پاروں کو دوسری زبان والوں تک پہنچانا اہم ہے اسی طرح دوسری زبان کے شاعروں کو اردو والوں سے متعارف کرانا بھی اہم ہے، اس مقصد کے تحت جعفری صاحب نے برج کے عظیم صوفی شاعر کبیر کو ناگری اور اردو لکھاوٹ میں اپنے فکر انگیز مقدمہ کے ساتھ پیش کیا اور کبیر کی شاعری کا غالب کی شاعری کی طرح عالمی پس منظر (WORLD VIEW) میں اس کی ادبی فکری بلندیوں کے تعارف کے ساتھ پیش کیا، اسی طرح پریم بانی میر میرابائی کے الوہی گیت اور بھجن مرتب کئے، پریم بانی کا مقدمہ، مشہور محقق ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری نے لکھا، اس طرح زبانوں کے تخلیقی لین دین میں بھی جعفری صاحب نے ایک اہم رول ادا کیا ہے اور اس اہم کام سے یکجہتی، بھائی چارہ اور قومی فکری دھارے کو وسعت اور توانائی عطا کی ہے۔ ہماری زبانیں چار لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جن میں سے دو بڑے لسانی خاندان ہیں۔ ہند آریائی اور دوسرا دراوڑی، ہند آریائی خاندان کی زبانیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور ان میں بہناپا ہے، لیکن دراوڑی خاندان کی زبانوں سے اگرچہ آریائی زبانوں کا کوئی رشتہ نہیں ہے، تاہم تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ بھی ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں، سنسکرت کے اثرات کے ساتھ فارسی عربی کے ان پر بھی گہرے اثرات ہوئے اور لفظی سطح پر ان میں مشترکہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں، اس لسانی ربط سے زیادہ ہمارا رشتہ فکری ہم آہنگی کا ہے جو صدہا سال کے مشترکہ فکری ورثے سے ہمیں حاصل ہوا ہے، پھر یہ بات کچھ کم اہم نہیں کہ اردو ادب کا ارتقاء جنوبی ہندوستان کی انھیں دراوڑی زبانوں کے درمیان ہوا اور یہ زبان یہیں سے سارے ملک میں پھیلی۔ یہ سارے رشتے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں اور ایک ہی مشترکہ ETHOS میں باندھ رہے ہیں، ان رشتوں کو تراجم کے ذریعہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، یہ عمل ہمارے یہاں شروع ہو چکا ہے تمل، تیلگو، ملیالم اور کنڑ زبانوں کے ترجمے ہندی میں ایک بڑی تعداد میں ہو چکے ہیں، اور نیشنل بک ٹرسٹ نے اس تخلیقی لین دین کے لئے راستے ہموار کئے ہیں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے منتخب ادب کے ترجمے کر کے ایک صحت مند ادبی اور ذہنی زندگی کو طاقت بخش رہا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کی منتخب شاعری، افسانے، ناول اور دیگر اصناف کے ترجموں کی مدد سے یہ مشکل کام آسان ہو گیا ہے، جعفری صاحب کے ہندوستانی زبانوں میں ترجمے نجی طور پر بھی ہوئے ہیں، مثلاً ان کی شاعری کا ایک اچھا انتخاب ہندی میں "پیاس کی آگ" کے نام سے ہوا ہے۔ یہ انتخاب راج کمل، دلی نے شائع کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ان کی مشہور تمثیلی نظم "نئی دنیا کو سلام" کا بھی ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کا مراٹھی ترجمہ नया अगाला प्रणाम کے عنوان سے شری پاد جوشی نے کیا ہے، جو اس سے قبل اردو شعر و ادب کو مراٹھی میں منتقل کرنے کا کام کرتے رہے ہیں۔

جعفری صاحب کا پہلا شعری مجموعہ "پرواز" شائع ہوا، جس کا دیباچہ ممتاز ناقد مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا۔ اس میں

www.taemeernews.com

ان کی ابتدائی شاعری کے نمونے محفوظ ہیں، یہ نظمیں ان کی شاعری کی اٹھان کا پتہ دیتی ہیں، لیکن حقیقتاً ان کی شاعری کی بلند پروازی کا دور "نئی دنیا کو سلام" اور اس کے بعد کا دور ہے۔ "پرواز" میں ان کی نظموں میں رومان اور انقلاب کی ملی جلی کیفیتیں ہیں، لیکن اس کی شاعری کے واضح فکری عناصر ان کی بعد کی شاعری کا حصہ ہیں، جب ان کا اپنا رنگ و لہجہ اور فکر و آہنگ ان کے اپنے اسلوب میں بدل جاتا ہے۔ ان کی اس شاعری پر اقبال اور جوش کے لہجوں کے اثرات بھی ہیں، لیکن انھیں لہجوں سے ان کا اپنا لہجہ اور رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے اور ان کی شاعری کا رنگ و اسلوب کسی دوسرے شاعر کے رنگ و اسلوب سے دبا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ جعفری صاحب کی شاعری کا یہ زمانہ سرمایہ دارانہ ظلم و استبداد کا زمانہ تھا، سامراجی استحصال کا دور تھا، لہٰذا اس میں ظلم و استبداد اور سامراجی استحصال کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ یہ احتجاج جس کا نقطۂ آغاز انگریز سامراج کے ہندوستانی مزدور، کسان اور غریب طبقہ کے استحصال سے ہو کر اس عہد کے جاگیر دارانہ نظام کے خلاف دعوتِ عمل دیتا ہے، آہستہ آہستہ وسیع تر معنی و مفہوم اختیار کر لیتا ہے۔ ملک و قوم پر ظلم و ستم کی یہ کہانی "ایشیا جاگ اٹھا" کی وسیع تر سرحدوں کو چھو لیتی ہے۔

جعفری صاحب کی تازہ کار اور توانا فکر ابتدا ہی سے انقلابی اور مصلحانہ فکر اپنے اندر سموئے ہے، یہ انقلاب اور اصلاح نظریاتی اور فکری اصلاح ہے، یہ فکر و خیال کی انجمن ظلم و جور اور اعلیٰ انسانی اقدار کے لئے نبرد آزما ہونے کا درس دیتی ہے اور ادب کے قارئین کی ذہنی تربیت کرتی ہے۔ اس میں عصری تقاضے، سیاسی رمز و کنائے، فکری اور شاعرانہ بلندیاں، انسان نوازیاں اور بھائی چارہ اور دوستی اور سیکولرزم کے ساتھ حب الوطنی کی اعلیٰ قدریں بھی شامل ہیں۔ وہ ذہنی زندگی کو تاریخ کے جمال اور جلال دونوں سے بیک وقت متعارف کراتی ہے۔ اس سلسلے میں جعفری صاحب کی بے شمار نظموں کے حوالے دئے جا سکتے ہیں، مگر یہاں اس کا موقع نہیں، تاہم سب سے پہلے میں کالیداس کی رتو سینہار سے ماخوذ ان کی نظم "موسموں کا گیت" کا حوالہ دینا چاہوں گا، جس کا براہِ راست تعلق تخلیقی لین دین سے ہے۔ یہ نظم نہ صرف کالی داس کا ترجمہ ہے بلکہ یہ جعفری صاحب کے دل کا صاف و شفاف آئینہ بھی ہے۔ اس نظم کا پہلا بند ہے۔

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، ان میں
حسن کی بات کریں، عشق پہ اصرار کریں
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکر لب و رخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہے مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

اور بسنت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

جوشِ گل یہ ہے کہ شاخوں کی جھکی ہے گردن
اور ہوا چلتی ہے لہکی ہوئی اتراتی ہوئی
جھیلیں ہیں سرخ کنوروں سے کنول کے روشن
عورتیں عشق کی کرنوں سے ہیں گدرائی ہوئی
دن سبک، نرم، رواں، شام حسین و شاداب
دل کے لے لینے کا انداز نہیں آتا ہے
جو بھی اس فصل میں بالیدہ و روئیدہ ہے
بوئے گل، رنگِ بہاراں میں بدل جاتا ہے

جعفری صاحب کے موضوعات میں تنوع ہے، مغرب سے مشرق تک، ویتنام، کوریا، کشمیر بلکہ ساری دنیا کے غم کو اپنے سینے میں جگہ دی، وہیں پر وہ ملکی مسائل، ہندوستان کی تہذیبی روایات اور مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری اور بھائی چارے اور صلح و آشتی کو اپنی شاعری کی ایک بنیادی قدر کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہند و پاک جنگوں کے پس منظر میں کہی گئی ان کی نظمیں کون دشمن ہے؟ اور صبح فردا کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ان کی حب الوطنی، وسیع الذہنی اور برصغیر کے دو مختلف سیاسی اکائیوں کے باوجود مشترکہ درد و غم اور مشترکہ تہذیبی ورثے اور ان کے لئے عزت و احترام کی علامتیں ہیں۔

www.taemeernews.com

"کون دشمن ہے" کہ صرف دو بند پیش کروں گی

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ بندوقیں
کہاں سے لائے ہو، کس کی طرف ہے رخ ان کا
دیارِ وارث و اقبال کا یہ تختہ ہے؟
جگا کے جنگ کے طوفاں زمین نانک سے
اٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر

اس کے بعد جعفری صاحب ہندوستان، یعنی غیر منقسم ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کے دردِ مشترک کے حوالے سے جو انھیں انگریزوں کی غلامی سے غربت اور لاچاری کی صورت میں ملا، کہتے ہیں۔

مزا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمھارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشن آشیاں کرتے
مگر تمھاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور
یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب؟
کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟
سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحدِ دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ
حسیں، بلند، مقدس، جوان، پاکیزہ
ہے اس کا نام خیابان جنت کشمیر
ہے اس کا نام گلستان دلی و پنجاب
ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنؤ بھی کبھی

سردار جعفری کی شاعری جیسا کہ میں نے اس سے پہلے کہا ہے، انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی شاعری ہے، ان کی شاعری ظالم کے خلاف بغاوت اور مظلوم سے ہمدردی کی شاعری ہے مذہبی منافرت، تنگ نظری اور استحصال کے خلاف احتجاج اور بغاوت ادیب اور شاعر کا ایک اہم مطمحِ نظر ہوتا ہے، ظلم اور مظلوم کی ایسے الفاظ میں جن کی تعبیریں اور تشریحیں نہیں کی جاسکتی، ان کے معنی ایک اور صرف ایک ہوتے ہیں اور ساری سیاسی فلسفہ طرازیاں ان الفاظ کے اصل معنوں کو پردوں میں نہیں چھپا سکتی شاعر اور ادیب کا قلم آزاد ہوتا ہے، اس کی فکر آزاد ہوتی ہے اور وہ جو محسوس کرتا ہے بغیر کسی جھجھک اور حوالے کے اپنی ذہنی افتاد کے زیر اثر اپنے خیالات کو پابند قلم کر لیتا ہے، اور اپنے افکار کو سیاسی مصلحت اندیشی کے بغیر بے کم و کاست قلم بند بھی کر دیتا ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

شاعر کا قلم انعام و اکرام کے لئے نہیں لکھتا، وہ اپنی آزادانہ رائے اور آزادیٔ فکر کو ہی اپنے قلم کی آبرو سمجھتا ہے، یہی اس کا انعام ہوتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے لئے جواب دہ ہوتا ہے، وہ عصری سیاست کے آگے سپر نہیں ڈالتا، نہ اسے اسیری کی فکر ہوتی ہے اور نہ تونگری کی، اس کے خیال کو بیڑی نہیں پہنائی جاسکتی۔ وہ جب لکھتا ہے اپنی انگلیاں خونِ دل میں ڈبو کر لکھتا ہے، جو درد وہ محسوس کرتا ہے اسے وہ اپنی فگار انگلیوں سے اور خوں چکاں خامہ سے زیبِ قرطاس کرتا ہے، غالب، چکبست اور فیض کی طرح سردار جعفری کہتے ہیں۔

کھڑا ہے کون یہ "پیراہن شرر" پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دیوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

۱۹۹۱ء میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد لکھی گئی سردار جعفری کی نظم "اجودھیا" جو سرکاری انعام و اکرام کے حوالے سے کم علموں بلکہ ان پڑھ لوگوں کی وجہ سے متنازعہ بن کر اخباروں کی زینت بنی "جنوں کی حکایت خوں چکاں" کی حالیہ تاریخ میں ایک نادر مثال ہے، جس پر ملک کے دانشور طبقے نے احتجاجاً اپنی آواز بلند کی اور ثابت کیا کہ سچائی کا نام لینے والے ابھی اس ملک میں باقی ہیں اور ملک میں جو مایوسی کی فضا ہے وہ عارضی ہے۔ گیان پیٹھ انعام حاصل کرنے پر قومی پریس، ریڈیو اور ٹی۔وی نے قومی سطح پر جو جعفری صاحب کی پذیرائی کی اس سے ہندوستان کے سیکولرزم اور روشن مستقبل کے لئے بشارت ملتی ہے۔ شعر و ادب کی تفہیم کے لئے اس زبان کے

www.taemeernews.com

شعری استعاروں سے واقفیت اور آگاہی ضروری ہے۔ اردو شاعری کی تفہیم(UNDERSTANDING) کے لئے اردو کے شعری استعاروں سے واقفیت کے ساتھ ہند اسلامی تاریخ کے اشاروں اور کنایوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اردو شاعری میں جب ظالم اور مظلوم کی بات ہوتی ہے تو میدانِ کربلا میں یزید اور امام حسین کے درمیان جنگ اور امام حسین کی شہادت نیکی اور بدی کا ایک بے مثال استعارہ METAPHOR بن جاتا ہے "اجودھیا" اردو شاعری کے اسی استعاراتی (SYMBOLIC) نظام سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے یہ نظم محض بابری مسجد کی شہادت کا منظوم قصہ نہیں ہے، یہ دراصل ایک ایسی حقیقت نگاری ہے جس میں ہندوستان کی مثالی آپسی محبت، بھائی چارہ، انسان دوستی کی اعلیٰ قدروں کے قتل اور خوں ریزی کا المیہ (TRAGEDY) ہے۔ بقول حسرت۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مختصر یہ کہ جعفری صاحب کی خدمات نظم، نثر اور تحقیق و ترجمہ میں گراں قدر اضافہ ہیں، وہ ہمارے عہد میں اردو زبان و ادب اور عصری دانشوری کا مینارۂ نور تھے، جن پر ہم سب ہندوستانی زبانوں اور ادبیات کے دانشور، اہلِ قلم اور طالب علم فخر کرتے ہیں۔

□□□

□□□

اردو اکادمی، دہلی کے افسانہ سمینار میں دائیں سے: جناب کشمیری لال ذاکر، جناب علی سردار جعفری، جناب حیات اللہ انصاری، جناب غلام ربانی تاباں اور پروفیسر قمر رئیس۔

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری

چند ٹوٹے پھوٹے تاثرات اور کچھ شکستہ یادیں

فضیل جعفری

A-3 301 سیکٹر VIII، شانتی نگر، میرا روڈ، تھانے (مہاراشٹر)

ابھی اردو والوں کے دلوں میں ترقی پسند غزل کے سب سے بڑے شاعر مجروح سلطان پوری کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا اور مجروح صاحب کی یاد میں منعقد ہونے والی تعزیتی نشستوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ترقی پسند تحریک و ادب کی مملکت کے آخری تاجدار، علی سردار جعفری نے بھی موت کی ناقابلِ تسخیر قوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ بقول مرزا شوق:

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

علی سردار جعفری اردو کی سب سے بڑی تحریک یعنی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہی نہیں تھے بلکہ اس کے اہم ترین نظریہ ساز بھی تھے۔ میں نے ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" کا شمار ابھی حال ہی میں زبیر رضوی کے رسالے ذہن جدید کے "ادب پیما" میں بیسویں صدی کی دس اہم ترین تنقیدی کتابوں میں کیا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد جب حالات بدلے اور نئی نسل کے شاعروں اور ادیبوں نے ادب کو استالینی جبر اور پارٹی لائن کے دائرے سے نکال کر حقیقی تخلیقیت اور عصری حقائق کا آئینہ دار بنانے کی کاوش کی تو ترقی پسندوں کی اکثریت بوکھلا گئی۔ جدیدیت پر حملہ کرنے والوں میں سجاد ظہیر، پروفیسر احتشام حسین اور علی سردار جعفری پیش پیش تھے۔ جعفری صاحب نے چوں کہ عمر بھی طویل پائی اور وہ زبردست خطیبانہ صلاحیتوں کے بھی حامل تھے اس لیے وہ آخر تک محاذ پر ڈٹے رہے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب جدیدیوں نے انھیں اور انھوں نے جدیدیوں کو تسلیم کر لیا۔ ہاں محترمی معین احسن جذبی انھیں ضرور شاعر تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ جہاں تک خطیبانہ انداز کا سوال ہے یہ چیز تو انیس، اقبال اور جوش کے یہاں بھی بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ جعفری صاحب انہی سے متاثر تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ تمام تر خطابت کے باوجود انھوں نے 'اودھ کی شام حسیں'، 'نیند'، 'پتھر کی دیوار' اور 'میرا سفر' جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو اردو شاعری میں بے مثال ہیں اور یقینی طور سے اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر تاحال فیض احمد فیض کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر کو وہ مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے حصے میں آئی۔ یہ صحیح ہے کہ سطحی قسم کے نیز جوڑ توڑ کرنے میں ماہر بعض افراد کی ریشہ دوانیوں کے سبب انھیں آخر تک ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نہیں مل سکا، لیکن ۱۹۹۸ء کے گیان پیٹھ ایوارڈ نے ساری کسر پوری کر دی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ان کی جو پذیرائی کی، وہ اب تک کسی بھی زبان کے گیان پیٹھ انعام یافتہ شاعر اور ادیب کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ۳۰/ اپریل ۱۹۹۹ء کو ہارورڈ فاؤنڈیشن (امریکہ) نے برصغیر میں قیام امن کی کوششوں کے لیے انھیں ایک خصوصی تقریب میں وہ اعزاز دیا جو ان سے پہلے ای۔ ایم فارسٹر، نیلسن منڈیلا، یاسر عرفات اور فیض احمد فیض کو دیا گیا تھا۔

علی سردار جعفری کی زندگی میں ان پر ادبی نوعیت کے الزام بھی لگائے گئے اور سیاسی بھی۔ سیاسی الزامات میں ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے ایمرجنسی کی حمایت کی اور 'حرفِ حق' کے عنوان سے نظم بھی لکھی۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ اس وقت سی۔ پی۔ آئی کی یہی پالیسی تھی جو ہمارے نزدیک صحیح تھی۔ ایمرجنسی کے نفاذ کی حقیقی وجہ اندرا گاندھی کے خلاف الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس سنہا کا فیصلہ نہیں بلکہ یہ تھی کہ فاشسٹ طاقتیں اس فیصلے کو بہانہ بنا کر ملک سے جمہوریت کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ جہاں تک فنکار کا سوال ہے خوشونت سنگھ، ایم۔ ایف۔ حسین، راجندر سنگھ بیدی اور سکندر علی وجد وغیرہ بھی ایمرجنسی کے حامیوں میں شامل

www.taemeernews.com

تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ گالیاں زیادہ تر جعفری صاحب کو ہی دی گئیں۔

ادبی سطح پر علی سردار جعفری میں یقیناً یہ کمزوری تھی کہ وہ ان لوگوں کو آگے بڑھاتے تھے جنھیں وہ نظریاتی اعتبار سے اپنا ہمنوا سمجھتے تھے۔ لیکن کیا آج وہ بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے ادبی دھنا سیٹھ جعفری صاحب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنگ نظر ہونے کے علاوہ ایذا پسند اور فتنہ پرور بھی واقع ہوئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مقابلے میں علی سردار جعفری ایک وسیع القلب اور اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے اور بارہا دیکھا ہے کہ جو لوگ انھیں دن رات برا بھلا کہتے تھے وہی اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو جعفری صاحب ان کی مدد کرنے والوں میں پیش پیش رہتے۔ مثال کے طور پر کئی سال پہلے جب ایک کانگریسی 'مرکش' شاعر کو بیماری کے عالم میں بذریعہ ہوائی جہاز دہلی سے بمبئی لایا اور پھر ایئرپورٹ سے سیدھا بابے اسپتال لے جایا گیا تو جعفری صاحب پہلے ہی اسپتال پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح دو ضخیم جلدوں میں اردو کی بہترین کہانیوں کو مرتب کرنے والے اور خواجہ احمد عباس کے ایک سابق سکریٹری جناب وحید انور ہندوستان سے پاکستان تک جعفری صاحب کو گالیاں دیتے پھرتے تھے لیکن جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو جعفری صاحب نے ہی ان کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اس کشادہ ذہنی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود ثقافتی اعتبار سے مذہبی آدمی تھے۔ غالباً ۱۹۹۴ء کی بات ہے۔ میں نے روزنامہ انقلاب کا جب ایک خصوصی عاشورہ ضمیمہ شائع کیا تو اس میں فیض احمد فیض کی 'مرثیۂ امام' نامی نظم بھی شامل کرلی۔ اسی دن جعفری صاحب کا فون آیا کہ فیض کربلا کی تاریخ سے واقف نہیں تھے۔ ان کی نظم میں متعدد تاریخی اور واقعاتی غلطیاں تھیں اور یہ کہ وہ ریکارڈ کو درست کرنے کی غرض سے ایک مضمون لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ اپنا تحقیقی مضمون لے کر بہ نفس نفیس دفتر انقلاب تشریف لائے۔ یہ مضمون ابھی تک انقلاب کے علاوہ شاید کہیں اور شائع نہیں ہوا ہے۔

میں ۱۹۷۵ء میں اورنگ آباد سے بمبئی منتقل ہوا۔ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کئی بار جعفری صاحب کو دیکھا اور سنا تھا لیکن ان سے پہلی ملاقات ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ بمبئی میں ٹی۔وی سینٹر نیا نیا قائم ہوا تھا اور علی سردار جعفری ہر ہفتے دوردرشن پر 'کہکشاں' کے عنوان سے ایک پروگرام پیش کرتے تھے جو جعفری صاحب کی شخصیت اور ان کے انداز گفتگو کے سبب غیر اردو داں طبقے میں بھی کافی مقبول تھا۔ اس پروگرام میں ایک بار انھوں نے (غالباً اخترالایمان کی سفارش پر) مجھے بھی مدعو کیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت پر کھل کر بحث ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات چیت میں قائل ہونے یا قائل کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس پروگرام کا بھی یہی حشر ہوا، ہاں بات چیت کے دوران کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ممبئی میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب جمع تھے۔ تصدیق سہاروی مرحوم اور محمود چھاپرا مرحوم کی کوششوں سے ہر ماہ کسی نہ کسی کے گھر پر ایک نشست ہوا کرتی تھی۔ ان نشستوں میں راجندر سنگھ بیدی، اخترالایمان، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، باقر مہدی، ظ۔ انصاری اور ندا فاضلی وغیرہ پابندی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کرشن چندر اور عصمت چغتائی بھی آجاتے تھے لیکن میری یادداشت کے مطابق جعفری صاحب کبھی شریک نہیں ہوئے۔ (ان نشستوں کی تمام تفصیلات تصدیق سہاروی کی کتاب "بحث و تکرار" اور یعقوب راہی کی کتاب "بات سے بات چلے" میں محفوظ ہیں) وہ تحریر و تقریر کے بادشاہ تھے لیکن مباحثوں سے کتراتے تھے۔ گزشتہ چار پانچ برسوں میں میری ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات ۱۸ رمارچ کو ہوئی۔ میرے ایک پرانے دوست جناب سمیع خطیب نے جوہو میں اپنے پرانے بنگلے کو منہدم کرکے نیا بنگلہ بنوایا تھا۔ خطیب صاحب صنعت کار ہونے کے علاوہ تعلیمی معاملات میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ انجمن اسلام اور انجمن خیرالاسلام کے تحت چلنے والے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ انھوں نے اپنے نئے بنگلے کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد کی۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں دلیپ کمار، ڈاکٹر رفیق زکریا، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، عبدالرحمن انتولے، فخرالدین خوراکی والا، بیگم ہمائی پیر بھائی اور کئی دوسری اہم شخصیتیں موجود تھیں۔ میں لان میں کھڑا ہوا اپنے کچھ پرانے ساتھی اساتذہ کے ساتھ گپ شپ کررہا تھا۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ سردار جعفری بھی آئے ہوئے ہیں اور اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

www.taemeernews.com

میں نے سوچا کہ جاکر سلام کرلوں اور خیریت پوچھ لوں۔ اس وقت تک مجھے تو کیا کسی کو بھی ان کی بیماری کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے جاکر سلام کیا۔ انھوں نے صرف ہاتھ اٹھادیا۔ میں نے کہا کہ آپ کی سالگرہ کے دن گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ "حیدر آباد جانے کا خیال تھا لیکن گیا نہیں۔ میں بمبئی میں ہی تھا۔" دراصل اس وقت تک ان کی یادداشت جواب دے چکی تھی کیوں کہ کچھ دنوں بعد بیگم سلطانہ جعفری نے بتایا کہ سردار جعفری اس دن واقعی حیدر آباد میں ہی تھے۔ سلطانہ بھابھی نے اپنے گھر پر اسی ملاقات کے دوران بتایا کہ جعفری صاحب ہاسپٹل میں تھے۔ ان کے دماغ کے اگلے دونوں حصوں میں ٹیومر کی تشخیص ہوئی تھی۔ وہ اب نہ کچھ بول سکتے تھے اور نہ ہی کسی کو پہچان پاتے تھے۔ بیگم جعفری نے یہ بھی بتایا کہ دماغ میں ٹیومر ہونے کے باوجود کسی کو ان کی بیماری کا اندازہ نہیں ہوا۔ انھوں نے کبھی سر درد کی بھی شکایت نہیں کی۔ ہاں ادھر چند ماہ سے وہ بہت کم گفتگو کرنے لگے تھے۔ اگر کبھی بولتے بھی تو ٹھہر ٹھہر کر اور بڑی دھیمی آواز میں۔ ان کی بیماری کا پتہ بہت بعد میں چلا۔ یہ جون ۲۰۰۰ء کی بات ہے۔

علی سردار جعفری مرحوم نے اپنی زندگی کا آخری مشاعرہ ۲۲ر اپریل کو نہرو سینٹر میں پڑھا۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ اسٹیج پر بیٹھ سکتے۔ انھیں اسٹیج کے نیچے ایک آرام دہ کرسی پر بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ مشہور افسانہ نگار اور جوائنٹ انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف مشاعرے کی نظامت کررہے تھے۔ میں نہ تو مشاعروں میں جاتا ہوں اور نہ ہی مجھے مدعو کیا جاتا ہے، لیکن میرے جو رفیق کار وہاں موجود تھے انھوں نے بتایا کہ اشرف کے بار بار درخواست کرنے کے باوجود جعفری صاحب چپ چاپ کرسی پر بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر قطعاً کوئی تاثر نہیں تھا۔ پھر ان کی کرسی کا رخ سامعین کی جانب کردیا گیا۔ وہ اس وقت بھی خاموش رہے۔ دس پندرہ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ سامعین بھی دم بخود تھے۔ اشرف اور سلطانہ بھابھی کے بار بار اصرار کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ "کوشش کرتا ہوں کہ کچھ یاد آجائے"۔ پھر انھوں نے اپنی مشہور نظم 'میرا سفر' سنانی شروع کی اور آخر تک سنائی۔ سامعین نے ان کے اعزاز میں تالیاں بجانی شروع کیں تو یہ سلسلہ کوئی دس منٹ تک جاری رہا۔

اس کے بعد ہی وہ اسپتال داخل ہوگئے۔ دو چار دنوں کے لیے گھر لوٹے لیکن پھر اسپتال میں انھیں دیکھنے کے لیے آخری بار سنیچر ۲۹ر جولائی کو ہاسپٹل گیا۔ پتہ چلا کہ انھیں اسپتال کی نئی بلڈنگ کے بستر نمبر ۱۰۵۹ سے پرانی بلڈنگ کے SPECIAL EXECUTIVEICU کے بستر نمبر ۳۷۸ پر منتقل کردیا گیا ہے۔ میں انھیں دیکھ کر بے حد افسردہ ہوگیا۔ ان کے وہ لمبے گھنے بال جو برسوں سے ان کی شخصیت کا حصہ تھے اور جن پر وقفے وقفے سے ہاتھ پھیرنا ان کی ایک خاص اور پرکشش شاعرانہ ادا بن چکی تھی تابکار شعاعوں کی وجہ سے بالکل صاف ہوچکے تھے۔ وہ بستر پر ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری بنے پڑے تھے۔ ناک اور منہ پر لگے ہوئے آکسیجن ماسک کی مدد سے صرف ان کی سانس چل رہی تھی۔ اس وقت ایک لیڈی ڈاکٹر انھیں انجکشن دے رہی تھی۔ جب وہ کیبن سے باہر نکلی اور میں نے ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے دھیمے اور غمگین لہجے میں کہا کہ "اب کوئی امید نہیں ہے"۔

یکم اگست کی صبح انھوں نے اپنا سفر مکمل کرلیا اور مالکِ حقیقی سے جاملے۔ پہلے یہ طے ہوا کہ انھیں اثنا عشری قبرستان 'رحمت آباد' میں دفن کیا جائے لیکن پھر بیگم سلطانہ جعفری کی خواہش کے احترام میں جوہو کے اسی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا جہاں ان کے کئی قریبی دوست، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور راہی معصوم رضا پہلے سے ہی زیرِ خاک آرام کررہے ہیں۔ ان کی مشہور نظم 'میرا سفر' کے یہ مصرعے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ انھیں زندگی اور اس کے بے پناہ نیز رنگارنگ پہلوؤں سے ہی عشق نہیں تھا بلکہ اپنے پسندیدہ شاعر مرزا غالب کی طرح اپنی شہرت دوام کا بھی یقین تھا۔

□□□

www.taemeernews.com

درد کا ساحل

(بہ یاد علی سردار جعفری)

رفعت سروش
A-80، سیکٹر 27، نوئیڈا (یو۔پی)

باعث رشک ہے تنہا روئی رہروِ شوق
ہم سفر کوئی نہیں دوریِ منزل کے سوا

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلِ رواں دردِ حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں

ان اشعار کا خالق سید علی سردار جعفری ایک شعلۂ رقصاں بروز بقر عید ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء ریاست بلرام پور کی ایک عالیشان کوٹھی میں پیدا ہوا جہاں ہاتھی جھولتے تھے اور یکم اگست ۲۰۰۰ء کو بمبئی کے ایک اسپتال میں دو ماہ تک بستر علالت پر موت سے نبرد آزما ہونے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس نابغۂ روزگار نے چار ماہ کم ۸۷ سال کی عمر پائی۔ اور عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ علم کے حصول، فروغ، اور انسانیت کے لیے بہتر سے بہتر کی جستجو اور جدوجہد میں گزارا۔ سردار جعفری کی زندگی بیسویں صدی کے ایک مردِ مجاہد اور انقلاب کے لیے چومکھی لڑائی لڑنے والے انقلابی کی داستان ہے۔ اس داستان کو کسی جگہ سے شروع کیجیے سردار جعفری جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ ابتدا میں اپنے روایتی اور مذہبی ماحول سے، اسٹوڈینس فیڈریشن کے اسٹیج پر انگریز کے خلاف پرچم بغاوت بلند کرنے اور حصولِ آزادی کے لیے، ترقی پسند مصنفین کی صفوں کو منظم کرنے اور ہم عصروں اور نئی نسلوں کو دقیانوسیت اور گلی سڑی روایتوں کے خلاف قلم اٹھانے اور نئی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے:

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قاتلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے

ملکی سیاست کے اسٹیج پر سمجھوتہ بازی، سرمایہ داری اور فاشزم کی طرف جھکاؤ کے خلاف پرچم بغاوت بلند کرتے ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے ہم چشموں کی تنقید ناروا سے ہنس کر آنکھ ملاتے ہوئے اور اپنی آوازِ صداقت کا پرچم اور بلند کرتے ہوئے یعنی زبان کے دشمنوں متحدہ قومیت اور سیکولر تہذیبی روایات کے حریفوں سے جم کر معرکہ لیتے ہوئے، ملکوں ملکوں اردو، ہندوستانیت اور انسانیت کا پرچم لہراتے ہوئے اور فکر معاش میں سرگرداں، بہتر سے بہتر زندگی کے لیے عملی جدوجہد کرتے ہوئے اور آخر دم تک دل و دماغ کے ہر بیماری سے لڑتے ہوئے:

ہتھیلیوں کے لیے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے

میں موسم گرما ۱۹۴۵ء میں جب پہلی بار علی سردار جعفری سے ملا تو ان کی زندگی کا آفتاب نصف النہار پر تھا میں انھیں کی تلاش میں کمیونسٹ پارٹی کے دفتر (بمبئی) کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک نوجوان زینہ پھلانگتا ہوا اوپر چڑھتا نظر آیا۔ میں نے مخاطب کر کے کہا مجھے علی سردار جعفری سے ملنا ہے۔ اس نوجوان نے کہا 'فرمایئے، میرا ہی نام سردار جعفری ہے۔ میں نے حیرت سے دیکھا مجاز نے دہلی میں مجھ سے کہا تھا کہ علی سردار جعفری ترقی پسندوں کا ظفر علی خاں ہے — اور یہ لڑکا!!— سردار جعفری کو میں نے مجاز کا تعارفی خط دیا۔ وہ مجھے اوپر اپنے دفتر لے گئے اور فرداً فرداً سب لوگوں سے ملوایا۔ یہ ہیں سید سجاد ظہیر، یہ سبط حسن، یہ کیفی اعظمی، یہ ضیاء الحسن وغیرہ وغیرہ۔ اور میں سردار جعفری کی معرفت اس وقت کے اہم لوگوں سے ملا جن کی قربت، دوستی اور شفقت نے میری زندگی

www.taemeernews.com

پر ایسے اثرات ڈالے جو آج تک ہیں۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف، پریم ساگر گپتا، رمیش سنہا، رومیش چندر، ہاجرہ بیگم، — کمیونسٹ پارٹی اور 'نیا زمانہ' اور 'نیا ادب' کا دفتر مجھے ایک علمی گھرانہ لگا اور اس عقیدتی گھر میں، میں روز تیسرے دن جانے لگا۔ سردار جعفری نے بطورِ خاص مجھ سے شفقت کا برتاؤ کیا۔ میری نظمیں 'نیا زمانہ اور نیا ادب میں 'چھاپنی شروع کر دیں۔ ان دنوں وہ 'سرخ ستارہ' نام کی کتاب مرتب کر رہے تھے، جس میں دوسری جنگ عظیم کے بارے میں نظمیں تھیں۔ میں نے ایک نظم 'کامرانی' کہی تھی وہ بھی اس میں شامل کی۔ میں ان دنوں بمبئی میں پاؤں زمانے کی کوشش کر رہا تھا، ایک دفتر — دوسرا دفتر — تیسرا دفتر — ان دنوں میں مسلم لیگ کے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء — ابتدائی تاریخیں تھیں۔ سردار جعفری نے کہا حیدر آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہے، چلو گے۔ میں نے کہا ضرور — رختِ سفر بندھا اور بمبئی سے ایک بڑا قافلہ کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوا۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، کرشن چندر، مہندر ناتھ، عادل رشید اور دانیال لطیفی — حیدر آباد پہنچے تو وہاں ملک کے دیگر شہروں سے مندوبین آ چکے تھے۔ فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، حسرت موہانی، وامق جونپوری اور بہت سے لوگ — حیدر آباد کی نمائندگی قاضی عبدالغفار، عابد علی خاں، مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، انظر حیدر آبادی اور دیگر نوجوان کر رہے تھے۔ اس وقت فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں۔ سردار جعفری کے حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کانفرنس کے دیگر اجلاسوں میں سردار جعفری کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور وہاں میں نے انھیں ہر اجلاس میں بے تکان، رواں دواں اور پُر مغز تقریریں کرتے سنا اور وہیں کے مشاعرے میں انھوں نے اپنی طویل نظم 'نئی دنیا کو سلام' کا ایک حصہ سنایا۔ ان دنوں سردار جعفری کی عادت تھی کہ نظم پڑھنے سے پہلے مختصر سی تقریر ضرور کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء کی کانفرنس کی کامیابی میں سردار جعفری کا بڑا ہاتھ تھا۔ اپنے رپورتاژ 'پودے' میں کرشن چندر نے صحیح کہا تھا کہ آپ سردار جعفری سے بات کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک تحریک سے مل رہے ہیں۔

حیدر آباد سے بمبئی آکر کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور انجمن اور فعال ہو گئی۔ جلسے، تقریریں، مشاعرے، رسالے ہر جگہ سردار جعفری جلوہ گر — اگست ۱۹۴۷ء تک — دو سال کا یہ عرصہ سردار جعفری کی تشکیل کا اہم دور ہے۔ (پرواز ۱۹۴۴ء) اس کے بعد ان کی اہم کتاب 'نئی دنیا کو سلام' آئی، جو بے شک اردو شاعری میں طویل نظم کے حوالے سے کامیاب اور اپنے قسم کا پہلا تجربہ تھا جس پر اقبال کی چھاپ ضرور تھی مگر موضوع سردار کا اپنا تھا۔ یہ فکر اقبال سے آگے کی چیز ہے اور اسے اقبال کی توسیع نہیں کہہ سکتے۔

میرے سامنے علی سردار جعفری کی تقریباً پوری زندگی ہے۔ ان کی ذہانت کی تفہیم کے لیے ان کا جائزہ تین زاویوں سے لینا ضروری ہے — شاعری، صحافت اور خطابت۔ سردار جعفری کی زندگی اور ان کا کام اسی مثلث سے عبارت ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ کہیں کہیں یہ تینوں اجزائے ترکیبی ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے سردار جعفری کو جس خصوصیت نے چمکایا وہ حسنِ خطابت ہے۔ اچھا مقرر ہونا ایک ایسی نعمت ہے، جو انسان کو ہزاروں لاکھوں میں امتیازی شان بخشتی ہے۔ کالج کے زمانے سے ہی سردار ایک ماہر ڈبیٹر کی حیثیت سے ملکی شہرت کے مالک ہو چکے تھے اور ان کی ولولہ انگیز انقلابی تقریروں نے ہی اس وقت کی حکومت کے کان کھڑے کر دیے تھے اور انھیں ۱۹۴۰ء میں ہی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا تھا۔ یہ زمانہ ہماری جنگِ آزادی کے عروج کا زمانہ ہے۔ ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک آزادی کی آگ دہک رہی تھی اور ملک کے سیاسی اسٹیج پر ایک سے ایک بڑا مقرر موجود تھا۔ کیا زمانہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد، جے پرکاش نارائن، ارونا آصف علی، کنور محمد اشرف، عطاء اللہ شاہ بخاری — ایسے ایسے مقرر جن کے الفاظ شعلے بن کر انگریزی سامراج کے قصر پر گرتے تھے۔ اس منظر نامے میں سردار جعفری نے ایک نوخیز اور نوجوان لیڈر کی حیثیت سے دھوم مچادی تھی اور ان کی پُر مغز تقریروں نے

www.taemeernews.com

بشارت دی تھی کہ یہ مقرر صرف جذبات سے کھیلنے والا نہیں ہے بلکہ اس کا زورِ خطابت سماج، انسانیت، ادب اور تہذیب ــــ ہر شعبۂ حیات کو اپنے لفظ سے آبِ حیات عطا کرے گا۔ چنانچہ آخر وقت تک سردار نے اپنے نظریات کو پُر اثر انداز سے پیش کیا اور ترقی پسند فکر کی بھرپور وکالت کی، ملک میں بھی اور بیرونِ ملک بھی۔

سردار جعفری نے اپنے حسنِ خطابت کے جواہر پاروں کو جہاں جہاں ضرورت ہوئی اپنی شاعری میں بھی سجایا اور اس طرح اپنا ایک الگ رنگِ سخن اردو شاعری کو دیا۔ شاعری کے ذکر سے پہلے دو لفظ ان کی صحافت کے بارے میں ــــ جب سردار نے قلم اٹھایا تو اس وقت صحافت بچوں کا کھیل نہیں تھی۔ اس دور کے صحافیوں کے نام لیجیے تو سماعت روشن ہو جاتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار، حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر۔ پھر ادبی منظرنامے میں شاہد احمد دہلوی، علامہ تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد گویا ایک صحافی، ایک تبحرِ عالم تھا، سیاست کے ساتھ ادب اور ثقافت کے نکات اس کے نوکِ قلم پر تھے۔ آسان نہیں تھا اس دور میں کوچۂ صحافت میں قدم رکھنا۔ جب سردار جعفری اور سبط حسن نے لکھنؤ سے 'نیا ادب' نکالا ــــ ایک ایسا ادبی پرچہ جو TREND SETTER ثابت ہوا اور پھر اس وقت کی بڑی پارٹیوں میں سے ایک کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری اخبار 'قومی جنگ' اور 'نیا زمانہ' کے ادارتی بورڈ کا رکن ہونا۔ ان دنوں اخبار و رسائل کے ایک ایک لفظ کی پکڑ ہوتی تھی اور اخبار نویس کو بار بار عوام کی عدالت کے سامنے آنا پڑتا تھا۔ مے صحافت کا ذائقہ سردار عمر بھر نہیں بھولے:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

انھوں نے 'نیا ادب' کی ادارت کے دور کے ایک عرصہ بعد 'گفتگو' جیسا ادبی مجلّہ جاری کیا، جو اردو صحافت کا ایک اور سنگِ میل ہے۔ اور اگر میں یہ عرض کروں تو شاید غلط نہیں کہ ان صحافتی تجربات نے ہی 'کتب پبلشرز' کی چھوٹی بڑی کتابیں شائع کرنے پر اکسایا اور ان کے ادبی اداریوں نے آگے چل کر 'ترقی پسند ادب' جیسی مفید کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ ان کی نثر کا دو ٹوک لہجہ صحافت کی کوکھ سے ہی پھوٹا ہے۔ ان کے یہاں "پیشہ ور نقادوں" جیسا تذبذب نہیں ہے جو ہر وقت اپنے قلم کی باگیں کسے رہتے ہیں کہ کہیں زیادہ تعریف نہ ہو جائے یا کھل کر مذمت کا پہلو سامنے نہ آ جائے۔ سردار جعفری کی نثر ایک بالغ اور صاف ذہن کی نثر ہے اور ان کے جملوں کے پیچھے ان کا علم اور تجربہ بولتا ہے۔

شاعری علی سردار جعفری کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھیں ایسا زمانہ ملا جو آزادی سے قبل اردو شاعری کا زریں دور ہے۔ یعنی علامہ اقبال اپنی شاعری کا جادو جگا چکے تھے۔ جوش ملیح آبادی کی شاعری شباب پر ہے، اور جگر، فانی اور حسرت موہانی زندہ ہیں۔ اور وہ شہر جہاں ان کی شاعری پروان چڑھی ــــ لکھنؤ ہے ــــ عزیز لکھنوی اور جعفر علی خاں اثر کا لکھنؤ ــــ سردار جعفری عنفوانِ شباب میں اپنے اس شعر کے ساتھ مطلعِ شاعری پر طلوع ہوتے ہیں:

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر لیے

یہ شعر سردار جعفری کی زندگی کا اشاریہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ غزل کے کوچے میں نہیں گئے بلکہ ان کے شعورِ آزادی نے انھیں جوش کے انقلابی اور باغیانہ رنگِ سخن کی طرف مائل کیا۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'پرواز' (مطبوعہ ۱۹۴۴ء) میں سب سے نمایاں نظم 'بغاوت' ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

اس نظم میں پرانی تہذیب، سرمایہ داری، اساطیری انسانوں، موجودہ حکومت، مسخ شدہ مذہب، ہر چیز سے بغاوت کا اعلانیہ ہے۔ بغاوت صرف انسان سے نہیں ہے۔ ترانۂ بغاوت کو وہ عصرِ حاضر کا ترانہ قرار دیتے ہیں ــــ دوسری قابلِ ذکر نظم 'خواب و خیال' ہے۔ اس نظم کا ذیلی عنوان ہے۔ 'زمانہ ما قبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ' اس نظم میں وقت، فکرِ انسانی اور ارتقا۔ تین کردار الگ الگ ہیں۔ اس نظم پر اقبال کی چھاپ ہے فکری اعتبار سے بھی اور لفظیات کے اعتبار سے بھی:

www.taemeernews.com

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا ستار

'پرواز' کے بعد سردار جعفری کی کتاب 'نئی دنیا کو سلام' سامنے آئی، جو شائع تو ہوئی ۱۹۴۷ء میں، مگر وہ طویل نظم ــــ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں کہنی شروع کی تھی اور ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو ختم کرلی تھی۔ سردار جعفری کی یہ نظم ایک طویل تمثیلی نظم ہے، جس میں ۱۸۴۰ مصرعے ہیں۔ مریم اور جاوید اس کے بنیادی کردار ہیں۔ پھر وقت ہے، انگریز ہے۔ نظم کا موضوع بہتر مستقبل کی تلاش ہے۔ یہ نظم بجائے خود شعری تجربات کا نگار خانہ ہے۔ پابند، آزاد، معریٰ، قطعہ بند۔ سب اصناف سخن موجود ہیں۔ یہ نظم اقبال کے مطالعے کے بغیر نہیں کہی جاسکتی تھی، مگر یہ اقبال کی صدائے بازگشت نہیں ہے۔ بلکہ سردار جعفری کی انفرادیت پر دلالت کرتی ہے۔ تجرباتی شاعری کے حوالے سے یہ دور وہ ہے جب ن۔ م۔ راشد، میراجی، فیض اور اختر الایمان اور ان کے ہم نواؤں کی معریٰ اور آزاد نظمیں آچکی ہیں۔ سردار جعفری نے پہلی بار اسی نظم میں آزاد نظم کی صنف کو اپنایا ہے اور اسے ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ راشد اور میراجی کی آزاد نظمیں، رکی تھمی، دھیمی دھیمی۔ سوچتی ہوئی شاعری کے نمونے ہیں مگر سردار نے آزاد نظم کو مکالموں کے لیے بھی استعمال کیا اور کہانی کے بیان کے لیے۔ ان کے حسنِ خطابت نے اس صنف میں ایک نیا آہنگ بھر دیا ہے اور عوامی ذہن و فکر سے قریب تر کردیا ہے۔ 'نئی دنیا کو سلام' ایک الگ مضمون کی متقاضی ہیں۔ اس طویل تمثیلی نظم میں سردار جعفری کی بہت سی ایسی نظمیں گتھی ہوئی ہیں جنھیں وہ الگ الگ سناتے رہے ہیں اور جو بہت مشہور ہیں ــــ مثلاً ــــ 'زندگی کا ترانہ':

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

یا وہ ٹکڑا:

روٹیاں شاخِ طوبیٰ پہ پھلتی نہیں ہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں ہیں
روٹیاں وحی والہام بن کر اترتی نہیں ہیں
یہ بھی انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
اس کی صدیوں کی محنت کا پھل

انسان کی جدوجہد اور بالخصوص ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے رنگ کو ابھارتی ہوئی یہ نظم جن اشعار پر ختم ہوتی ہے وہ بہت بلیغ ہیں:

یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ، انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں، فلک پر نظر جمائے ہوئے

۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو سردار جعفری کی شادی سلطانہ بیگم سے ہوئی اور زندگی کی اس خوشگوار تبدیلی کا اثر سردار جعفری کی شاعری پر پڑا ــــ آزادی کے بعد ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق سردار کی شاعری میں احتجاج کا لہجہ بہت نمایاں ہے۔ حکومتِ وقت نے انھیں ۲۰ر جنوری ۱۹۴۹ء کو گرفتار کرلیا اور آٹھ ماہ کا عرصہ انھوں نے ناسک جیل میں گزارا ــــ قید و بند کی صعوبتوں سے قطع نظر یہ عرصہ سردار جعفری کی شاعری کا ایک اہم موڑ ہے، ــــ ان کی اس دور کی نظمیں۔ 'خون کی لکیر' (۱۹۴۹ء) اور 'پتھر کی دیوار' (مطبوعہ اگست ۱۹۵۳ء) میں موجود ہیں۔ اگرچہ انھوں نے 'ایشیا جاگ اٹھا' طویل نظم بھی جیل ہی میں کہی جو ان کی شاعری کے انقلابی آہنگ کی امین ہے ــــ مگر ناسک جیل میں جو نظمیں انھوں نے اپنی بیوی اور بچے کی یاد میں کہی ہیں وہ ان کی شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ کرتی ہیں۔ جیل کا ماحول دیکھیے:

"جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے
بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں
کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلادوں کی خونخواری پر
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدد کا نظام"

(جیل 'خون کی لکیر' سے)

www.taemeernews.com

بچے کی یاد میں:

نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انگڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
اک حسیں پری بن کر
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی۔

(نیند ــــ 'پتھر کی دیوار')

بیوی کی یاد میں:

میں لکھ رہا ہوں
تمھاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
میں پڑھ رہا ہوں
تمھاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھنوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں
تمھاری آنکھیں، تمھاری پلکیں کہانیاں سنا رہی ہیں

(تمھاری آنکھیں ــــ 'پتھر کی دیوار')

پتھر کی دیوار کے بعد 'ایک خواب اور' (مطبوعہ مارچ ۱۹۶۵ء) سردار جعفری کی شاعری کا عروج ہے، یہاں تک آتے آتے سردار کی شاعری کا آہنگ سڈول اور لہجہ زیادہ غنائی ہو گیا ہے ــــ کہیں کہیں لگتا ہے ان کی اور فیض احمد فیض کی آواز ایک جیسی ہے:

آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گزشتہ کی کتاب
بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
تابشِ رنگِ شفق، آتش روئے خورشید
مل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خون احباب
دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

(ایک خواب اور)

سردار جعفری کے اس مجموعہ کلام میں غزلیں بھی ہیں اگرچہ غزل گوئی سردار کا مزاج نہیں:

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے
مہک رہی ہے غزل ذکرِ زلفِ خوباں سے
نسیمِ صبح کی مانند کو بہ کو کہیے

'ہاتھوں کا ترانہ' مشہور نظم بھی اسی مجموعہ کلام میں ہے:

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو، ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

سردار جعفری کی اہم اور دیرپا نظموں میں 'میرا سفر' ہے۔ اور آج جب کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، اس نظم کی معنویت اور بڑھ گئی ہے۔ یہ نظم دراصل کسی ایک انسان کی نہیں، زندگی کی نظم ہے، زندگی جو کبھی نہیں مرتی، زندگی جو اپنا روپ بدلتی رہتی ہے۔ غالب نے اس بات کو یوں کہا تھا:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

رومی کا یہ مصرعہ خود سردار جعفری نے ذیلی عنوان کے طور پر لکھا ہے۔ 'ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ایم' یہ خیال بہت بڑا نہیں ہے، مگر جس شگفتگی اور فنی مہارت سے سردار جعفری

www.taemeernews.com

نے اسے اپنی نظم میں سمویا ہے اس نے س نظم کو بڑا بنادیا ہے، اور یہی سردار کا کارنامہ ہے۔ نظم اس دن کے تصور سے شروع ہوتی ہے جو یکم اگست ۲۰۰۰ء کو آچکا:

"پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق وصدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی"

ان مصرعوں میں موت کو کتنا خوبصورت اور ہلکا پھلکا بنادیا ہے۔ پھر موت کے بعد بھلا دیے جانے کی منزل کا ذکر کرتے ہوئے سردار حیاتِ نو کی بشارت دیتے ہیں۔ ان مصرعوں کا حسن، روانی، سادگی، لطافت، سب کچھ ایک بڑی شاعری کی پہچان ہے۔

"لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا۔

کتنا حسن اور رومانس ہے مرنے کے بعد اس طرح دوبارہ جینے میں۔ زندگی کے حسن سے بھرپور یہ نظم حیاتِ انسانی کی اس حقیقت کے اظہار کے بعد ختم ہوتی ہے:

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں۔

اگر سردار جعفری یہی ایک نظم لکھتے تو بھی وہ اردو شاعری کے نگار خانے میں امر ہو جاتے۔ مگر ایسی خوبصورت اور بصیرت افروز نظم لکھنے کے لیے زندگی کا وہ سفر ضروری ہے جو سردار جعفری نے سرانجام دیا۔

سردار جعفری بنیادی طور پر انقلابی شاعر تھے۔ محبِ وطن تھے، عالمی بھائی چارے کے تصور کو عام کرنے میں انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزارا۔ وہ عالمی امن کے سپہ سالاروں میں تھے اور ہر اس جنگ سے نفرت کرتے تھے جس کی بنیاد تعصب اور نفاق ہو۔ وہ ہمارے ان شاعروں میں تھے جو ادبی محفلوں، گروہوں اور طبقوں میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے عوام میں، مشاعروں میں انھیں ہزاروں لاکھوں کے مجمعے کو خطاب کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اور ان کے اس فن نے انھیں تحت اللفظ اشعار پڑھنے کے باوجود ساری عمر مقبول بنائے رکھا جب کہ اردو شاعری کی عوامی مقبولیت ننانوے فیصدی ترنم پر ہے۔

سردار جعفری شاعری برائے شاعری کے قائل نہیں تھے، وہ مقصدیت کو اولیت کا درجہ دیتے تھے، اور ان کا مقصد اپنی ذات کی تشہیر نہیں، بلکہ ان اقدار کی تشہیر تھا جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بناتی ہیں۔ ان کی اسی خصوصیت نے انھیں مقبولیت کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچا دیا تھا۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، اقبال سمان اور گیان پیٹھ تک ان کی مقبولیت کا ایک بہت طویل سلسلہ ہے۔ وقت کے ساتھ حکومتوں نے بھی ان کی ذہانت اور فن کی عظمت کا لوہا مان لیا

www.taemeernews.com

تھا۔ وہ پدم شری بنادیے گئے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو سے لے کر اندرا گاندھی، اندر کمار گجرال اور اٹل بہاری باجپئی جیسے ملک کے پرائم منسٹروں نے سردار جعفری کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ ہند و پاک دوستی کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے موقعے پر ان کی نظم 'صبحِ فردا' محبت کی نئی کرن کی طرح طلوع ہوئی تھی۔ وہ نظم ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے اور گزشتہ پینتیس سال سے عوام کی فرمائش پر انھوں نے یہ نظم سینکڑوں بار سنائی ہوگی۔ اس نظم کی مقبولیت کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے دل سے نکلی جس نے جنگ آزادی میں قربانیاں دیں اور اپنی زندگی کو امن و محبت کے فروغ کے لیے وقف کردیا۔ اس نظم کی اہمیت یوں اور بڑھ گئی جب دو سال پیشتر 'لاہور ملاقات' کے موقع پر یہ نظم 'صبحِ فردا' پرائم منسٹر شری اٹل بہار باجپئی نے پاکستان کے پرائم منسٹر جناب نواز شریف کو تحفہ کے طور پر پیش کی۔ یہ نظم سردار کی شاعرانہ عظمت اور مقصدیت کے امتزاج کا خوبصورت اظہار ہے:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

تقسیم وطن کی ہولناکیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نظم ہند و پاک کے عوام کے دلوں کی ترجمانی اس طرح کرتی ہے کہ آج جب یہ تقسیم تاریخی حقیقت بن چکی ہے تو یہ تقسیم اب ایسی ہے جیسے سیندور کی لکیر بالوں کو دو حصوں میں بانٹتی ہے — باہمی محبت کا اظہار اس سے خوبصورت ممکن نہیں ہے۔ ان اشعار پر نظم ختم ہوتی ہے:

یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا
(۲۵ ستمبر ۱۹۶۵ء)

یہ صبحِ فردا ضرور طلوع ہوگی اور اس صبحِ فردا کا سورج سردار جعفری کی روح کو صحیح خراجِ عقیدت ہوگا۔

سردار جعفری کا موت کے ہاتھوں بے بس ہو کر ہمارے درمیان سے اٹھ جانا اردو والوں کا تو ناقابلِ تلافی نقصان ہے ہی، یہ برِ صغیر کا نقصان ہے، پوری عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔ ایسا ہمہ جہت اور اولوالعزم فنکار اور یار طرحدار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

سردار جعفری خاک و خوں سے کھیلتے درد کے ساحل تک جا پہنچے — مگر وہ بھی ان کی آخری منزل نہیں کیوں کہ وہ — ایک گریزاں لمحہ ہیں اور ایام کے افسوں خانے میں پھر آئیں گے — فطرت نے ان کی معرفت اپنا پرانا کھیل کھیلا ہے اور وہ جاگ کر پھر سو گئے ہیں۔

□□□

□□□

اردو اکادمی، دہلی کے ایک پروگرام میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے جناب علی سردار جعفری ساتھ میں جناب رفعت سروش اور جناب سکندر بخت

www.taemeernews.com

شعری اظہار اور سردار جعفری

مظہر امام

13-176، پاکٹ ۱، میور وہار ۱، دہلی 110091

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ علی سردار جعفری کی بنیادی حیثیت شاعر کی ہے۔ ان کی تعینِ قدر کے لیے تقریباً پچپن سال پر محیط ان کے کلام کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ (غالباً گزشتہ دس سال میں انھوں نے کچھ نہیں کہا) ان کی اس بنیادی حیثیت پر سرِ دست کچھ اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ سردار کا پہلا مجموعہ کلام 'پرواز' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس وقت تک فیض، راشد، میراجی، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر اور اختر الایمان کے مجموعے منظر عام پر آ چکے تھے۔ 'پرواز' ان سب کے مقابلے میں کمزور مجموعہ ہے۔ اس پر جوش کا اثر حاوی ہے۔ عنوانات سے ہی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بغاوت، سرمایہ دار لڑکیاں، دیہاتی لڑکیاں وغیرہ یا پھر اشتراکی سیاست کے تحت لکھی ہوئی نظمیں ہیں مثلاً لینن، جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر، وغیرہ۔

سردار جعفری کا شاعرانہ اعتبار ان کی تمثیلی نظم 'نئی دنیا کو سلام' سے قائم ہوا۔ ترقی پسند ادیب و شاعر ۱۹۴۴ء تک آزاد نظم نگاری کے مخالف تھے۔ لے دے کر مخدوم نے ایک نظم اس ہیئت میں کہی تھی۔ سردار جعفری نے یہ طویل نظم ۱۹۴۶ء کی آخری تاریخوں میں مکمل کی۔ ایک سال بعد شائع ہوئی۔ انھوں نے آزاد نظم کو ایک خاص جہت سے آشنا کیا اور یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار اس صنف میں کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس نظم کے کئی حصے بہت خوبصورت اور اثر انگیز ہیں۔ یہ اپنے وقت میں اپنی نوعیت کی پہلی نظم تھی۔ اس نظم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اسے عام طور پر سراہا گیا ہے۔

بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں کمیونسٹ پارٹی نے کئی روپ بدلے اور ان کے راست اظہار نے سردار جعفری کی شاعری کو نزاعی بنا دیا۔ پہلے آزادی کا جشن منایا گیا اور فوراً ہی اسے "فریب" سے تعبیر کیا گیا۔ 'جشنِ آزادی' کا عنوان 'خواب' سے بدل دیا گیا۔ 'خواب' اور 'فریب' دونوں نظمیں جعفری کے مجموعہ کلام 'خون کی لکیر' میں شامل ہیں جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ان دو نظموں کے علاوہ بھی 'خون کی لکیر' کی تقریباً سبھی نظمیں فوری اور ہنگامی موضوعات پر ہیں اور ان کے لہجے میں گھن گرج اور خطیبانہ آہنگ ہے۔ اسی مجموعے میں جعفری کی ایک مشہور اور 'مقبور' نظم 'رومان سے انقلاب تک' ہے جو ۱۹۴۹ء میں 'سویرا' لاہور میں چھپی تھی۔ اس عنوان کے نیچے درج ہے:

"پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید"

آزاد نظم کی ہیئت میں تقریباً سوا سو لائنوں پر مشتمل ہے۔ یہ اپنے وقت کی بڑی ہنگامہ خیز نظم تھی۔ احتشام حسین نے ایک باقاعدہ مضمون اس نظم کی فکری خامیوں کو واضح کرنے اور ترقی پسند نقطۂ نظر کے انتہا پسند رویے کی تردید میں لکھا تھا۔ اس نظم کی ابتدائی سطریں ہی خاصہ گرم ہیں:

ساتھیو! اب مری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرما رہا ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تاکہ میں اپنے نغموں میں فولاد و بارود کا زور بھر دوں
میں تمھاری صفوں میں تمھاری طرح

www.taemeernews.com

اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا

اس نظم میں سترہ لائنیں لگاتار 'اک طرف' سے شروع ہوتی ہیں:

اک طرف ماؤ ہے، اک طرف چیانگ ہے
اک طرف مارشل، اک طرف مالوتاف
اک طرف کالی فسطائیت، اک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ، اک طرف گورکی

وغیرہ۔ اور آخر میں وہ اپنے رفیقوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

شاعرو! ساتھیو!
کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سرخ پرچم کے سائے میں آؤ
اور نئے گیت گاؤ
گاؤ مزدور کے ساز پر
گاؤ جمہور کے ساز پر

وغیرہ۔

یہ محض ایک مثال ہے۔ اس طرح کی مثالیں سردار جعفری کی ۳۸۔۱۹۳۷ء سے لے کر ۴۹۔۱۹۴۸ء تک کی شاعری میں بطور خاص خوب خوب مل جائیں گی۔ کہا گیا ہے کہ جب فیض کو زنداں کی دیواروں کے درمیان گوشۂ تنہائی میسر آیا تو ان کی شاعری پر بہار آئی۔ میں سمجھتا ہوں سردار جعفری کا جیل جانا بھی ان کے حق میں فال نیک ثابت ہوا۔ وہ اپنی اشتراکی سرگرمیوں اور اشتعال انگیز نظموں کی پاداش میں ۱۰ر اپریل ۱۹۴۹ء سے اندازاً جون ۱۹۵۰ء تک آرتھر روڈ جیل بمبئی اور سینٹرل جیل ناسک میں قید رہے۔

وہ ۱۲ر اپریل ۱۹۴۹ء کو سلطانہ کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"ہمیں اس لیے بھی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ مجھے آرام پہنچا رہی ہے تاکہ تھکے ہوئے دل و دماغ کو تھوڑا سا سکون مل جائے۔ دنیا کے کئی شاہکار جیلوں میں لکھے گئے ہیں۔ میں اگر یہاں زیادہ دن رہا تو میں بھی بہت کچھ لکھوں گا جو بہت دنوں سے لکھنا چاہتا ہوں۔"

اپنی گرفتاری کے دوران میں انھوں نے چند نہایت اچھی نظمیں لکھیں مثلاً 'پتھر کی دیوار'، 'نیند'، 'اودھ کی خاک حسیں'۔ ان کے علاوہ 'تمھاری آنکھیں'، 'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' بھی جیل میں ہی کہی گئی تھیں۔

میں 'پتھر کی دیوار' کو سردار جعفری کی شاعری کا ایک خوبصورت موڑ مانتا ہوں۔ اس نظم کا یہ اقتباس دیکھیے:

پتّیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے

جیل ہی میں انھوں نے اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ پر نظم 'نیند' لکھی:

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

اس نظم کے اقتباسات بار بار پیش کیے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں ان کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا۔ ان نظموں کے ذریعہ پیکر تراشی کے نہایت عمدہ نمونے سامنے آئے۔ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا بھی برجستہ اور فطری استعمال ان کی اس وقت کی کئی نظموں میں ملتا ہے۔ ان نظموں میں سردار جعفری کا اپنا لہجہ ابھرتا ہے جو اقبال اور جوش کے اثر سے آزاد ہے۔ جعفری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے فیض اور دوسرے شاعروں کے مقابلے میں نظم کو غزل کے اثر سے نجات دلانے میں مدد دی۔ 'پتھر کی دیوار' اور 'نیند' کی بحر میں صرف دو ارکان 'مفتعلن مفاعلن' کی تکرار ہے اور اس سے ایک ایسا خوبصورت آہنگ پیدا ہوا ہے کہ اس وقت کے کئی شاعر اس

www.taemeernews.com

سے متاثر ہوئے۔ خود میری نظم 'خواب سچ بھی ہوتے ہیں' اسی بحر اور آہنگ میں ہے۔ اور تو اور سردار جعفری کے سخت گیر نقاد کلیم الدین احمد کی چار نظمیں اسی وزن اور اسلوب میں ملتی ہیں، بلکہ بعض مصرعے بھی ہو بہو ایک جیسے ہیں۔ یہ نظمیں ان کے مجموعے '۴۲ نظمیں' میں شامل ہیں۔

خیر، یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ سردار کی گرفتاری نے ان کے شعری سفر کو ایک نئی اور بہتر جہت دی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی طول کلامی کم و بیش اسی طرح برقرار رہی۔ جذبی نے ۱۹۵۱ء میں جب اپنا دوسرا مجموعہ چھپوایا تو اس کا نام 'سخنِ مختصر' اپنے اس طنزیہ شعر کی بنیاد پر رکھا:

یہاں ہے طول کلامی نثر کا سکّہ
یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا

میں نے جیل کی دو نظموں 'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' کا ذکر کیا ہے۔ دونوں نسبتاً مختصر ہیں۔ سردار نے بعد میں اور کئی مختصر نظمیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایک مختصر سی خوبصورت نظم لکھی تھی، جسے اس زمانے میں ناقدوں نے سراہا تھا۔ اس کا ایک مصرع یاد رہ گیا ہے:

پھول سے کھل گئے تصور میں

پھر جب ان کی بلند آہنگ شاعری کا زور ہوا تو اس نظم کو طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا اور مجھے یاد نہیں کہ گزشتہ چالیس پینتالیس سال میں اس نظم کا حوالہ کسی مضمون میں آیا ہو۔

ان کے مجموعے 'ایک خواب اور' میں پانچ مصرعوں کی ایک خوبصورت نظم ہے۔ ایک انٹرویو میں سردار نے اسے نیوڈ پینٹنگ (NUDE PAINTING) کہا ہے، نظم دیکھیے:

نسیم تیری قبا، بوئے گل ہے پیراہن
حیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیلِ سحر، جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں، چاند جھلملاتا ہے

کیا فوری طور پر ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ ایک خوبصورت عریاں جسم کی تصویر ہے؟ سردار چمن شاعری میں کیسے کیسے گل کھلانے کے اہل تھے!

مجموعہ کلام 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء) اور 'ایک خواب اور' (۱۹۶۵ء) کے درمیان اچھا خاصہ وقفہ ہے۔ جعفری نے موخرالذکر مجموعے کے دیباچے میں لکھا ہے:

"خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایسا حق ہے، جس سے کوئی طاقت، کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا۔"

یہ سب صحیح، لیکن نہ تو شکست خواب کا مرثیہ پڑھنے سے کوئی شاعر بڑا ہو جاتا ہے اور نہ نئے خواب دیکھنے کا اپنا حق حاصل کرنے سے۔ مسئلہ وہی شعری اظہار کا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جیل کی تنہائی نے سردار کو اپنی ذات کے اندر اترنے کا موقع دیا اور وہ خارج کو اپنے داخل کا حصہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ جدیدیت کا اصرار تو اسی پر تھا۔ نجی واردات اور نجی احساس کو انھوں نے کئی نظموں میں بڑی اثرانگیزی سے برتا۔ خاص طور پر 'میرا سفر' اور 'حسین تر' میں۔ اپنی بیوی کو سامنے رکھ کر ایسی تابناک نظمیں کہنا جعفری کا ہی حصہ ہے۔ اور یہ ساری اردو شاعری میں بالکل نیا تجربہ ہے۔ ان نظموں میں بیوی کسی فرد واحد کی شریک حیات نہیں رہتی بلکہ آج کی عورت کا استعارہ بن جاتی ہے۔

عورت کے حسن و شباب کا تذکرہ تو شاعری میں ہوتا ہی رہا ہے، لیکن عورت یا بیوی کے بڑھاپے کے حسن اور اس سے فریفتگی کا اظہار جعفری کے علاوہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ ان نظموں میں جذبے کا وفور ایک ایسی لطافت پیدا کرتا ہے کہ ذہن و دل ایک امتزازی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ 'میرا سفر' کے اقتباسات کیا، تقریباً پوری نظم بار بار حوالے میں آتی رہی ہے۔ پھر بھی کچھ ٹکڑوں کا دہرانا ضروری معلوم ہوتا ہے:

ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

www.taemeernews.com

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

'میرا سفر' ۱۹۵۶ء کی تخلیق ہے۔ 'حسین تر' اس کے آس پاس کی۔ اس کا حوالہ نسبتاً کم آیا ہے، لیکن یہ واقعی اعلیٰ درجے کی تخلیقی کاوش ہے:

ہماری عمر رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تار چاندی کے گوندھ دے گی

تری کتابِ رُخِ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اک کہانی
اور ان گنت جھریوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

پھر ایک تو ہوگی اور اک میں
کوئی رقیب رفیق صورت
کوئی رفیق رقیب ساماں
مرے ترے درمیاں نہ ہوگا
ہوس کی نظروں کو تیرے رُخ پر
جمالِ نو کا گماں نہ ہوگا
فقط مری حسن آزمودہ
نظر یہ تجھ کو بتا سکے گی
کہ تیری پیری کا حسن تیرے
شباب سے بھی حسین تر ہے

میں سمجھتا ہوں کہ سردار جعفری کی شاعری کا بہترین دور ('نئی دنیا کو سلام' کو چھوڑ کر) ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ہے۔ اسی دور میں انھوں نے وہ نظمیں کہیں جو انھیں ادب میں زندہ رکھنے کا سبب بن سکتی ہیں۔

ہمارے ایک معتبر شاعر اور صحافی فرحت احساس نے ایک بہت اچھی بات کہی ہے کہ آج سردار جعفری کی شہرت اور مقبولیت کی بنیاد ان کا اصل شعری اظہار نہیں بلکہ وہ موضوعاتی نظمیں ہیں جو ہند پاک دوستی کے فروغ اور جنگ کے خلاف ماحول سازی کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے ہم جیسے ادب کے قاری کے لیے کوئی حوصلہ افزا بات نہیں ہے، لیکن فرحت احساس نے اس کا ایک مثبت پہلو بھی تلاش کر لیا ہے جس سے اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ کہ ان نظموں سے اردو کے شعری سرمایے میں کوئی اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے ذریعے ہمارے ملک اور برصغیر کے بعض اہم سیاسی اور تہذیبی معاملات میں اردو زبان و ادب کی سرگرم مداخلت درج ہوئی۔ یہ پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن فوری طور پر سردار کی نظم 'کون دشمن ہے' کی طرف جاتا ہے جس کے یہ آخری مصرعے بار بار دہرائے جاتے ہیں:

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

میرا خیال ہے کہ جعفری کی تازہ ترین نظمیں جو اب سے کم و بیش پندرہ بیس سال پرانی ہیں، ان میں ایک بار پھر ان کے بدلے ہوئے مزاج اور شعری اسلوب کا واضح عکس ملتا ہے۔ ان میں طرزِ اظہار کی خوبصورتی اور نفاست زیادہ ہے اور الفاظ کے دلکش دروبست سے ایک خاص طرح کے جھنکار کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ یہ نظمیں کم دستیاب ہیں، اس لیے ان کا حوالہ بھی شاذ ہی آتا ہے۔ بہر حال ان کی دو نظموں کے ایک ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

وزن: فعلن فعولن فعلن فعولن

وادی بہ وادی منزل بہ منزل
صحرا بہ صحرا، ساحل بہ ساحل
قاتل ہی قاتل، قاتل ہی قاتل
دل سا سپاہی سب کے مقابل
اے شہسوارو!
اے شہسوارو!

(نظم: "اے شہسوارو")

وزن: فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

رہگزر رہگزر کارواں کارواں
پیاس کی سرزمیں، پیاس کا آسماں
خواب درخواب رقصاں ہے جوئے رواں
سارباں! اور کچھ تیز بانگِ جرس
العطش!
العطش!
العطش!

(نظم: 'العطش')

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں سردار جعفری کی حیثیت نزاعی رہی ہے۔ ان کے نظریات اور ان کے طرزِ سخن پر اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ نئی نسل سے ان کا رشتہ 'محبت اور نفرت' (LOVE AND HATE) کا رہا ہے۔ سردار کو بھی اس کا احساس تھا کہ نئی نسل ان سے منحرف ہو سکتی ہے لیکن انھیں نظر انداز نہیں کر رہی ہے۔ انھوں نے 'گفتگو' کے 'ترقی پسند ادب نمبر' (۱۹۸۰ء) کو تحفے کے طور پر نئی نسل کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے اپنی ایک نظم پیش کی ہے۔ یہ نظم 'نئی نسل کے نام' ہے۔ اس کے کچھ خاص حصے دیکھیے:

مجھ سے نظر چرا کر کہاں جاؤ گے
اے مرے آفتابو!
راہ میں رات کی بیکراں جھیل ہے
اور اونچی ہیں لہریں
آسمانِ سخن کے نئے ماہتابو!
تیرگی پوچھتی پھر رہی ہے تمھارا پتہ
اے مرے شعلہ پیکر عقابو!
اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا
سچ کہو کیا تمھارے تراشے ہوئے نقط میں
میری آواز کا شائبہ بھی نہیں؟

میری آواز پتھر میں شعلہ ہے
شعلے میں شبنم
اور طوفاں میں طوفاں
اور تمھارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے
سچ کہو
آنے والے زمانے کی روشن کتابو!
مجھ سے نظروں چرا کر کہاں جاؤ گے؟

سردار اپنے آپ کو اس سے بڑا خراج اور کیا پیش کر سکتے تھے؟۔ □□□

اردو اکادمی، دہلی کے مشاعرے میں جناب علی سردار جعفری کلام پیش کرتے ہوئے۔ تصویر میں نظر آرہے ہیں جناب مظہر امام اور جناب بلراج کومل

خراجِ عقیدت

کفیل آزر

○

وہ مفکر، وہ مقرر، وہ محبت کا امیں
زخم کیسا بھی ہو تکلیف تو ہوتی ہے اسے
اس کے ہر خواب کی تعبیر ہے اب نوحہ کناں
اس کی دانشوری اور شاعری روتی ہے اسے

ایشیا جاگ اٹھا ، ٹوٹ گئی ہر سرحد
تونے یہ لکھ تو دیا پورا مگر ہو نہ سکا
بھائی چارے نے جو سرحد پہ قدم رکھے تھے
کچھ نہ مل پایا وہاں بم کے دھماکوں کے سوا

وہ ورق لکھے گئے جس پہ قلم کے رشتے
وہ ورق اب تری تحریر کو ترسے گا بہت
تونے جس خواب کو پلکوں پہ سجا رکھا تھا
ہاں ترا خواب وہ تعبیر کو ترسے گا بہت

کوئی دنیا میں نہ ادنیٰ ہو نہ اعلیٰ کوئی
مذہب و دھرم کے جھگڑے ہوں نہ ہوں شاہ و غلام
پیاس دھرتی کی اب انساں کے لہو سے نہ بجھے
تیرے اس عزم و عمل جہدِ مسلسل کو سلام

اب کب آئے گا بتا امن کی خوشبو بن کر
جب ترا گیت پرندوں کی زباں گائے گی
یونہی بن جائے گا سردار یہاں ہر عاشق
اور معشوقہ بھی سلطانہ ہی کہلائے گی

422۔ضیا محل، جامع مسجد، دہلی110006

www.taemeernews.com

شعر و ادب کا شاہیں، گردوں شکار!

انور عظیم
A-104، پیراڈائز سوسائٹی، 40، اندراپرستھا ایکسٹنشن، دہلی 110091

اردو تہذیب و دانش و ادب کا بلند پرواز شاہیں، علی سردار جعفری، ہماری حد نظر سے آگے چلا گیا ہے۔ جذبہ وہی ہے جس کو جواہر لال نہرو کی موت پر مخدوم محی الدین نے اپنی مختصر نظم میں اسیر کرنے کی کوشش کی اور اس کے سحر میں خود ہی اسیر ہوگئے۔ آج تک اس غم کی شدت لوگ محسوس کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی جذبہ اردو کے کج کلاہ شاعر سردار کی موت کے ہرے زخم کو اور بھی ہرا کر رہا ہے۔

جب سردار جعفری کے تیر کی طرح کمان سے نکل جانے کا خیال آتا ہے تو مخدوم کی امیجری غم اور حیرت سے ہمیں دیکھتی ہے۔ ایک ایسا تیر جو زمان و مکان کی حدوں سے نکل گیا اور ازل سے ابد کی طرف پرواز کر رہا ہے۔

شاعر ادیب، ہر زمانے میں بہت ہوتے ہیں لیکن وقت کا نقیب ہونا بہت کم لوگوں کی قسمت میں ہوتا ہے۔ وقت کا نقیب سردار کو ان کے مفکرانہ "اندیشہ دور و دراز" نے بنایا تھا۔ شاعر کی نظر میں شاعری "آرائش خم کاکل بھی تھی اور اندیشہ دور و دراز" بھی یہاں سردار جعفری کا آہنگ اقبال کے آہنگ میں کھو جاتا ہے۔ اقبال کی طرح سردار جعفری کا فکری دائرہ پیچ در پیچ ہے اور رچی ہوئی جمالیاتی قدروں سے آراستہ۔ اس آہنگ میں ساری دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعرانہ ثروت کا رچاؤ شامل ہے۔ کوئی تنگ نظر سردار کی بلند آہنگی پر جتنا بھی طعنہ زن ہو وہ سردار کو "عقیدہ پرست" کہہ کر اپنے زمانے سے کاٹنے میں کامیاب نہیں ہوگا اور نہ ان کی فنی غنائیت چھین سکے گا۔ ان کی شاعرانہ غنائیت فکر و فن کا سرچشمہ ہے۔

"میرا سفر" اور "پتھر کی دیوار" شاعرانہ اظہار کی نیرنگیوں کا شاندار محافظ خانہ ہیں۔ اس لئے ہم ایک طرف سردار کو اپنے عہد کے اقبال کی طرح دیکھتے ہیں اور دوسری طرف ان کو ہم غالب کے ہمنوا اور روحانی امین کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس کی منطقی وجہ ہے۔ سردار بار بار اپنی تحریروں اور ادب نوازوں کی محفلوں میں غالب کا ایک شعر خاص طور پر پیش کرتے تھے:

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اس شعر میں غالب کے فلسفیانہ رجحان اور قلبی تپش کا بہت معنی خیز اظہار ہے۔ اس کی گہرائیوں کا تجزیہ ہو تو دانشوروں کو پتہ چلے کہ سردار جعفری اور غالب کی ہم خیالی کی جڑیں کہاں پیوست ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے "قد و گیسو" اور "دار و رسن" کے سائے میں رکیں تو دو صدیوں کے دو شاعروں کے اظہار کے بہت سے اسرار کھلیں گے۔ سردار کا لب و لہجہ اپنے عہد کی غنائیت اور معنویت میں ڈوبا ہوا ہے دیکھئے:

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہ تمام آیا ہوں میں
میکشو آتش بہ جام کر یاہوں میں
میرے پیمانے میں گم ہے کائنات
میرے میخانے میں صہبائے حیات
میرے آئینے میں عکس صبح نو
آفتاب عہد آزادی کی ضو
شہسوار گردش ایام ہوں

www.taemeernews.com

انقلاب وقت کا پیغام ہوں

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غالب کی صدی کے بعد کے شاعر اور اس کی تخلیقیت کا دلآویز منشور ہے جس کے سوتے خود شاعر کے شعور اور شعر میں گبرے ہیں۔ آپ کو غالب کے کلاسیکی اظہار میں تبدیلی کی شاعرانہ اور والہانہ خود آگہی نہیں ملے گی۔ ان کے یہاں رجائیت کی وہ دھڑکن نہیں ہے۔ غالب بہادر شاہ ظفر کے دور کے شاعر تھے۔ شاہی کا زمانہ تھا اور آزادی کوئی جمہوری تصور نہیں تھا۔ علی سردار جعفری کے یہاں تھا اور یہ اتنا رچا ہوا تھا کہ شاعر اپنے ایام کو "عہد آزادی" کہتا ہے اور بیسوی صدی کے عوام سے وہ رشتہ قائم ہوتا ہے جو "عہد آزادی" کا ضمیر ہے۔ انسان کی بنیادی پناہ گاہ اور چشمہ فیضان کا عرفانی نقطہ!۔

عام طور پر انگریزی ادب کی نصابیات کی اصطلاحیں انگریزی کے طالب علم اور اساتذہ پر یکساں حاوی ہیں اور وہ زیادہ تر ولائل HOME-SPUN ارتقا سے نہیں بلکہ غیر متعلق تخلیقی سلسلہ عمل سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ جو بھی ہو، انگریزی اور غیر ملکی ادب کا اکتساب یا مستعار تنقیدی انفرادیت یا عظمت، ہر زبان و ادب کی اپنی روایات اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہی ورثہ ہے جو قومی شاعروں کو ان کا انوکھا پن دیتا ہے حالانکہ یہ صحیح ہے کہ سماجی اور تاریخی ارتقا کو اپنی تخلیقیت کی دھڑکن بنانے کے لئے دوسری زبانوں کے کارناموں سے فیضیاب ہونا چاہئے۔ ہو سکے تو اس کی مثبت قدروں کو اپنی فکر کا حصہ بنانا چاہئے۔

اس قسم کی کاوش ٹی. ایس. ایلیٹ کو اپنی حسیت کا حصہ بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ خصوصیت ہے جو جمالیاتی تلاش و اظہار میں ایک مثبت خدمت انجام دیتی ہے۔ سردار جعفری پر بعض حلقوں کا یہ الزام ہے کہ ان کی شاعری آئیڈیولوجی کی پروردہ ہے۔ یہ ان لوگوں کی مجبوری ہے جو اپنی محدود نظر سے دوسروں کے آفاقی کارناموں کو جانچتے ہیں۔ ٹی. ایس. ایلیٹ کا حوالہ انسانی آفاقیت کی وجہ سے ہے حالانکہ دنیا کی نظر میں وہ ایک جدید شاعر ہیں جن کی حسیت عالمگیر جنگوں کے پیدا کئے ہوئے انتشار کی پروردہ ہے۔ سردار جعفری کو، اپنے عصر میں کھو جانے کے باوجود اپنی تلمیحات اور پیکر تراشی نے ایسی دلنشیں مشرقیت بخشی تھی جو ان کے فن اور عینیت کی پہچان بن گئی ہے۔

شاعر نے زندگی کو زندگی کی طرح جینے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ سردار جعفری نے حالات کے ایک خاص دور میں ALIENATE ہونے کے باوجود ٹھوس تاریخی حقیقتوں سے منہ نہیں موڑا نہ اپنے پیش رو اقبال کے تراشے ہوئے SYMBOLS سے نظر بچائی۔ اسی لئے اپنے وقت سے دامن کشیدہ ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تخلیقی عمل کو وقت کی ہمنوائی ایک بشارت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسی خوبی نے سردار جعفری کی شاعری کو مستقبل کا ہمنوا بنا دیا ہے۔

ہمارے عہد کا یہ اردو شاعر جس کے بزم سے اٹھ جانے سے ہم اتنا سوگوار ہیں، زندگی اور اس کی لطافتوں کا جری نغمہ خواں تھا۔ نغمہ خواں اور مزاج داں۔ اس کے جمالیاتی اسلوب اظہار میں مشرقی روحانی تہہ داریوں کا عجیب طلسم ہے۔ شاعر نے مغربی نو آبادیاتی بربریت کا جرأت رندانہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اس کی قیمت ہنس کر ادا کی۔ شاعر کبھی مشرق کی افسردہ طربناکیوں سے آبدیدہ نہیں ہوا۔ بلکہ ہر تاریخی تجربے کو شاعر نے اپنے شعور کے جام و سبو میں ڈھال لیا اور تلوار کی دھار پر اپنی منزل کی طرف چلتا رہا۔ اس میں ایشیا کی تاریخ اور فلسفیانہ عرفان کی تازہ کاری ہے۔ اسی انفرادی ثروت نے سردار جعفری کو ہمارا حبیب جاوداں بنا دیا ہے۔ ان کے فکر و اظہار میں اتنی دلنوازی پیدا کر دی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو الفاظ اندھیری رات میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ اور گاتے ہیں:

موج کی طرح سے وابستۂ ساحل ہی نہ رہ
حسن کے بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
قطرۂ اشک لرزتی ہوئی پلکوں پہ نہ بن
جھلملا گوہر خوش آب دور خشاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں
پھیل جا نکہتِ گل، رنگ بہاراں ہو کر

www.taemeernews.com

یہ رجائیت فنا نا آشنا ہے! اسی میں ان کے فن اور عینیت کا راز پوشیدہ ہے اور کچھ ایسا پوشیدہ بھی نہیں۔ اس لب و لہجے کا فلسفیانہ آہنگ اور نغماتی کمک دور رس ہے۔ اور ہمارے زمانے کے بعد بھی دل میں اس سے لرزش پیدا ہوگی۔ یہی لرزش شاعر کے فکر و نظر کی امین ہے اور یہ کہ اس کی رسائی ہمارے زمانے سے آگے جانے والی مقناطیسیت ہے۔

سردار جعفری کے اندر متلاطم شاعری اپنی زندگی کے ہر ساحل کو آنسوؤں سے دھوتی رہی لیکن ان کے ہونٹوں پر جلتی ہوئی قندیل کی صنف کبھی مدھم نہیں پڑی۔ یہی روحانی ارتفاع شاعر کے تخلیقی افق کا ضامن ہے سردار جعفری اپنی موت کے بعد بھی زندگی کی دروں بینی اور اس کے نتائج کے فیاض ہیں اور رہیں گے!

اپنے عہدِ شباب میں غزل سرا علی سردار جعفری

اس طرح شاعر کے سفر کی بات سمجھ میں آتی ہے

اس پس منظر میں شاعر کی نظم "میرا سفر" کو دیکھنے کی اور اس کے POIGNANT پہلوؤں کا ادراک حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ تب ایک مضطرب دل کی آفاقیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمہلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

سردار نے اپنی زمین کو جس پر وہ جیئے، جس سے انہوں نے عشق کیے، جہاں انہوں نے حسن پرستی کے آداب سیکھے اور وارفتگی کو اپنے طرزِ حیات کا جزو بنایا اور زنجیر و سلاسل کی اذیتیں جھیلیں وہ آفتاب کے گرد گردش میں رہے گی۔ یہ زمین بھی اپنے اس سپوت کو بھولی نہیں۔ نہ بھولے گی! شاعر نے اپنے شیدائیوں سے وعدہ کیا ہے:

میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
... میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

اس یقین کا پرچم مستقبل کے ہاتھ میں لہرائے گا۔ جب تک اردو تہذیب زندہ رہے گی یہ اندازِ سخن بدلتی ہوئی شکلوں اور پیکروں میں زندہ رہے گا۔ کلاسیکیت کی تقدیر کوئی نہیں بدل سکتا۔

□□□

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری کی فکری اور فنّی جہات

(منتخب نمائندہ نظموں کے حوالے سے)

پروفیسر زاہدہ زیدی

نمبر 4 HIG فلیٹ، سر سید نگر، علی گڑھ۔ 202002

علی سردار جعفری اپنے دور کے ایک بہت اہم اور مقبول شاعر تھے اور ان کی شہرت عالم گیر تھی، لیکن پھر بھی ان کی زندگی میں ان کی شاعری کے بارے میں کچھ سطحی اور گمراہ کن تصورات رائج رہے۔ یعنی اپنے مداحوں کے لیے تو وہ ایک پرجوش انقلابی شاعر تھے اور مخالفوں کے لیے اشتراکی نظریے کا پرچار کرنے والے ایک نعرہ باز شاعر یہاں تک کہ کچھ حاسدوں اور تنگ نظر لوگوں نے تو اس خیال کو بھی مشتہر کرنے کی کوشش کی کہ سردار جعفری شاعر تھے ہی نہیں صرف نثر نگار تھے اور ترقی پسند تحریک کے ایک خود ساختہ لیڈر اور ان کی شہرت اور اہمیت ان کی سیاسی جوڑ توڑ کا نتیجہ تھی۔

راقم الحروف کی رائے میں یہ تینوں آرا سراسر غلط اور انتہائی گمراہ کن ہیں۔ گو کہ اس میں شک نہیں کہ سردار جعفری کی قد آور شخصیت اور شہرت کسی حد تک ان کی تنقیدی صلاحیتوں اور دانشورانہ کارناموں کی بھی مرہون منت تھی۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہی تھے اور ان کی شاعری تنقیدی توجہ اور سنجیدہ مطالعے کی مستحق ہے۔ ان کی شاعری میں فکری اور فنی اعتبار سے وسعت اور تنوع بھی ہے اور ایک ارتقائی کیفیت بھی اور یہ مقالہ سردار جعفری کی شاعری کے ان اہم پہلوؤں کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔

سردار جعفری کی ابتدائی دور کی شاعری میں 'پتھر کی دیوار'، 'اودھ کی خاکِ حسیں'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'فریب'، 'نیند' اور ان کا منظوم ڈرامہ 'نئی دنیا کو سلام' اہم اور قابلِ قدر تخلیقات ہیں۔ جن میں اس دور کی فکری اور فنی خصوصیات زیادہ نمایاں طور پر عکس فگن ہیں۔ 'پتھر کی دیوار' ایک منفرد انداز کی کامیاب نظم ہے جو شروع سے آخر تک شدت فکر و احساس اور تخلیقی بالیدگی کا نمونہ ہے اور جس میں انقلابی فکر کے ساتھ پروٹسٹ کا جذبہ بھی بڑی شدت سے کارفرما ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ کافی جاذبِ توجہ ہے۔ اور یوں تو اس کے سبھی شعری پیکر منفرد اور اثر آفریں ہیں لیکن خاصہ طور سے شاعر نے یہاں 'پتھر' کے امیج کی تکرار سے جو کیفیت پیدا کی ہے وہ پروٹسٹ کے جذبے کی ایک کامیاب تجسیم ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

پتھروں کی دیواریں
بارکوں کو تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں

پتھروں کی دیواریں
بھوک کا بھیانک روپ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں

پتھروں کی دیواریں
جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستی
ان کے سخت چہرے پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے

www.taemeernews.com

اور اس پروٹسٹ کے جذبے کے ساتھ ساتھ جسے 'پتھر' کے امیج نے اپنے اندر جکڑ لیا ہے۔ سردار جعفری کی انقلابی فکر بھی اس نظم میں خوبی سے عکس فگن ہے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے ...

اسی طرح کی ایک اور مثال ہمیں 'نئی دنیا کو سلام' کے حرف اول میں بھی ملتی ہے جسے ایک مکمل نظم کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں سیاہی کے امیج کی تکرار سے سردار جعفری نے غلام ہندوستان میں عمومی صورت حال کی ایک المناک اور پریشان کن تصویر کھینچ دی ہے جو سراسر غیر فطری اور انسانیت سوز ہے۔ چند شعر دیکھیے:

سیاہ رنگ بھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے یہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں
یہ عقاب یہ آسماں پہ چھائے ہوئے
یہ چراغ ، یہ روشنی ، سیاہ لویں
سیاہ گھر میں یہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کپڑوں کی مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے

اور اس طرح تقریباً بیس اشعار کی اس نظم میں سردار جعفری نے صرف 'سیاہ' اور 'یہ' کی تکرار سے ایک دل ہلا دینے والا منظر پیش کرتا ہے اور ہر شعر میں یہ امیج صورت حال کے ایک نئے پہلو کو پیش کر دیا ہے اور پیکر تراشی کی اس تہ دار معنویت نے اس نظم کو ایک طویل استعارے میں بدل دیا ہے۔

اس دور کی ایک اور اہم نظم 'اودھ کی خاکِ حسیں' ہے جس میں 'پتھر کی دیوار' کے مقابلے میں جذبے کا گداز اور دردمندی کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ اس نظم کی کچھ نمایاں خصوصیات اودھ کی سرزمین سے شاعر کی والہانہ محبت، انسانوں سے گہری ہمدردی اور محبت، فطرت سے والہانہ لگاؤ اور نوسٹلجیا کی کیفیت ہیں اور ہر جذبہ خوبصورت اور دلنواز شعری پیکروں میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں مینگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں ــــ اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنا بجا رہی ہیں۔

لیکن 'اودھ کی خاکِ حسیں' شاعر کے لیے صرف فطرت کے حسین مناظر کا ایک سلسلہ ہی نہیں بلکہ اس میں انسانی زندگی کے مناظر اور عوامل بھی شاعر کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کے تصور میں ساقیوں کا خرام اور جام و مینا کی گردشیں نہیں بلکہ سیدھی سادی زندگی کے مانوس اور دلکش مناظر ہیں جن میں ماں کے سفید آنچل اور بہنوں کی مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ وہ غریب کسان بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوار رہے ہیں اور یہ مانوس مناظر بھی:

لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
تتلیاں گنگنا رہی ہیں

سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان مناظر کی دلکشی بھی شاعر کے والہانہ جذبوں اور دلفریب پیکر تراشی ہی کی مرہونِ منت ہے اور یہاں ورڈز ورتھ کی طرح سردار جعفری نے مانوس مناظر کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سادگی کے باوجود غیر معمولی تخیل آفریں اور حیرت زا معلوم ہوتے ہیں اور یہ اس نظم کی ایک مخصوص فنی جہت ہے۔ نظم کے آخری حصے میں انگریزی حکومت کے مظالم اور انقلابی تحریکوں کا ذکر بھی اسی شدومد سے کیا گیا ہے۔ اور گو کہ اس حصے میں فکری عناصر کا اظہار براہِ راست ہے لیکن اظہار کی ندرت قائم رکھی گئی ہے۔ مثلاً:

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
جھکے ہوئے سر ابھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں

اس نظم میں سردار جعفری کی فکری، جذباتی اور فنی جہات بڑی خوبی سے ہم آمیز ہیں۔ فطرت سے والہانہ لگاؤ، انسانوں سے گہری ہمدردی، ظلم واستبداد کے خلاف پروٹسٹ کا جذبہ اور انقلاب کا ایک والہانہ تصور نوجوان شاعر کی پرسوز شخصیت کے غماز ہیں اور ساتھ ہی یہ نظم فنی خوبیوں سے بھی آراستہ ہے اور اس کی پیکر تراشی اور استعارہ سازی بھی جاذبِ توجہ اور تخیل آفریں ہیں اور انھیں خصوصیات کے باوصف "اودھ کی خاکِ حسیں" کو سردار جعفری کی شاعری کے دورِ اول میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اس دور کی ایک اور بہت اہم نظم 'ایشیا جاگ اٹھا' ہے، جس کا کینوس زیادہ وسیع ہے اور جس کا اسٹرکچر تصوراتی ہے۔ یعنی اس میں تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی تصورات کو اہمیت حاصل ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار ہی میں شاعر نے اپنے موضوع کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رخ سے نقاب الٹی
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی ساتنا کا سبق پڑھایا

ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰؐ کے سر پر چمک چکا ہے
ہمارا ورثہ منجو داڑو سے لے کے دیوارِ چین تک ہے
ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرامِ مصر تک ہے
ہمیں روایات کے خزانوں سے بابل و نینوا ملے ہیں

اور ایشیا کا ورثہ یہ عظیم مذاہب، اخلاقی روایات اور فنِ تعمیر کے کارنامے ہی نہیں بلکہ ادب اور شاعری کے خزانے بھی ہیں، جو تخیل کی بلندی، فکر کی گہرائی اور جذبے کی پاکیزگی کے شاہکار ہیں اور فردوسی، سعدی، خیام، حافظ، نظیری، تلسی، والمیکی، کبیر اور سورداس سے لے کر اقبال اور ٹیگور تک معجزہ ہائے فن کی ایک کہکشاں ہے، جس میں شاعروں کے خونِ جگر کے ساتھ ساتھ ایشیا کی عظمت بھی نغمہ زن ہے۔

فطرت سے والہانہ محبت یہاں بھی نمایاں ہے لیکن اس کا اظہار زیادہ علامتی اور فکر پرور ہے، جو موضوع کی گہرائی اور وزن کی وسعت کا زیادہ کامیابی سے احاطہ کرتا ہے۔ مثلاً:

اداس صحرا پیمبروں کی طرح سے خاموش اور گمبھیر
کھجور کے پیڑ بال کھولے

ہمالیہ کے گلے میں گنگا کی اور جمنا کی شوخ باہیں
بلندیوں پر خفیف سا ارتعاش ہلکی سی راگنی کا

لیکن یہاں بھی سردار جعفری کی شاعری کا محور صرف فطرت نہیں بلکہ انسان ہیں اور کسان، مزدور، جہاز، ملاح، الاؤ کے گرد بوڑھے افسانہ گو، جوان ماؤں کی گود میں ننھے بچے، فضاؤں میں بانسری کی تانیں اور ہرے بھرے کھیتوں میں چوڑیوں کی جھنکار بھی اس منظر نگاری کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اور ساتھ ہی شاعر کی نظر ان دل شکن مناظر اور المناک حقیقتوں پر بھی پڑتی ہے جو ایشیا جیسے 'شاداب اور دھنوان' برِ اعظم کا مقدر بن گئے ہیں، جہاں ننھے بچوں کو بھوک کے ناگ ڈس رہے ہیں۔ جہاں کسانوں کو گیہوں کی روٹی اور صاف کپڑے بھی میسر نہیں اور ان کی انگلیاں کتابوں کے لمس اور ذہن تعلیم کی روشنی سے محروم رہے اور ان افسوس ناک حالات کے سامنے شاہوں کے محل اور محرابیں، رعونت سے اٹھائی ہوئی لاشیں، کانسی کے

www.taemeernews.com

گھوڑے اور سنگ مرمر کے مجسمے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں لیکن ان المناک حالات کے باوجود یہاں بھی نظم کا اختتام انقلابی فکر کا ترجمان ہے اور اس کا انداز رجائی ہے البتہ اس آخری بند کے اختصار نے اسے نعرے بازی کے الزام سے بچالیا ہے۔ 'ایشیا جاگ اٹھا' اس دور کی ایک اہم اور نمائندہ نظم ہے، جس میں شاعر نے اہم اور وسیع موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور گو کہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ شاعر نے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے کیوں کہ یہ موضوع بے حد وسیع اور اس کے مقابلے میں شاعر کا تجربہ اور علم محدود ہے۔ لیکن والہانہ جذبوں کے خلوص فکری عناصر کی آمیزش، اظہار کے بے ساختہ پن، مشاہدے کی دراکی اور پیکر تراشی کی ندرت اور معنویت نے اسے ایک یادگار نظم بنادیا ہے۔ اور اس میں سردار جعفری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار بڑی خوبی سے ہوا ہے۔

اس دور کی سب سے اہم تخلیق 'نئی دنیا کو سلام' ہی ہے، لیکن کیوں کہ میں اپنے ایک اور مقالے میں اس کا تجزیہ کر چکی ہوں اور یا ثابت کر چکی ہوں کہ وہ ایک تمثیلی نظم نہیں بلکہ تجریدی انداز کا منظوم ڈرامہ ہے، اس لیے یہاں اس کے تذکرے سے گریز کروں گی۔

سردار جعفری کے دوسرے دور کی شاعری میں 'ایک خواب اور'، 'ہاتھوں کا ترانہ'، 'قتل آفتاب'، 'پیراہن شرر'، 'سر طور'، 'میرا سفر'، 'حسین تر'، 'ہمارے نام' اور 'دو چراغ' اہم اور قابل توجہ نظمیں ہیں۔ لیکن یہاں صرف دو تین نظموں پر ہی روشنی ڈالنا ممکن ہے۔

سب سے پہلے 'سر طور' جس کو سردار جعفری نے 'آسمان پردازوں' کے نام منسوب کیا تھا لیکن اس کا تناظر واقعاتی نہیں بلکہ آفاقی ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہاں خلائی پرواز میں سردار جعفری کو اپنے وژن کے اظہار کے لیے ایک OBJECTIV - CORELATIVE مل گیا ہے جس میں ڈھل کر اس نے ایک طویل استعارے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ گو کہ سردار جعفری سائنس کے بہت قائل تھے لیکن یہاں انھوں نے خلائی سفر کو سائنس کے معجزے کے طور پر نہیں بلکہ انسان کے عزم، تلاش، جستجو، بلند حوصلوں اور بے پایاں تخلیقیت کے مسحور کن اظہار کے طور پر پیش کیا ہے اور شدت فکر و احساس کی بھٹی میں تپ کر یہ تصورات مناسب شعری پیکروں اور استعاروں میں ڈھل گئے ہیں اور تصورات کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے میں سردار جعفری کو کمال حاصل تھا۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

ہاتھ کاٹے گئے جرأت شوق پر
خوں چکاں ہو کے وہ گلشاں ہوں گئے
حیرتوں نے لگائی جو مہر سکوت
لب خموشی میں جادو بیاں ہوگئے
راستے میں جو کہسار آئے تو ہم
ایسے تڑپے کہ سیل رواں ہوگئے
ہیں ازل سے زمیں کے کرے پر اسیر
ہو کے محدود ہم بیکراں ہوگئے
شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں
ہے ابھی رفعتِ آسماں اور بھی
ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں
کہکشاں سے پرے کہکشاں اور بھی

اس نظم پر علامہ اقبال کا اثر کافی نمایاں ہے جو یوں بھی سردار جعفری کی شاعری میں جاری و ساری ہے اور نظم کے آخری شعر:

کہہ دو برقِ تجلی سے ہو جلوہ گر
آج موسیٰ نہیں ہم سر طور ہیں

میں موسیٰ اور جلوہ طور کی قرآنی تلمیح نے نظم کی معنویت میں ایک اور جہت کا اضافہ کردیا ہے۔

'میرا سفر' بھی اس دور کی ایک نہایت اہم نظم ہے جو سردار جعفری کے مرکزی وژن کی تجسیم ہے۔ اس میں انھوں نے کئی اہم تصورات مثلاً زندگی کی قوت نمو، تخلیقی توانائی، تسلسل حیات، زندگی اور موت کے تواتر اور وقت کے تصور کو ایک سجل اور لطیف فورم میں ڈھال دیا ہے جو اپنی معنویت میں ایک طویل استعارے سے قریب تر ہے۔ اس نظم کی بڑی خوبی

www.taemeernews.com

اس کا اختصار، ارتکاز، شعری آہنگ اور شعری پیکر ہیں جو بڑی لطافت سے گہرے اور پیچیدہ تصورات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

جاڑے کی ہوائیں دامن میں
جب فصل خزاں کو لائیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
بستی سے مری بھر جائیں گی

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں

فکری اور فنی دونوں اعتبار سے 'میرا سفر' ایک مختصر شاہکار سے کم نہیں اور اسے بجا طور پر سردار جعفری کے شعری نظام میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اس دور کی ایک اور مختصر نظم 'دو چراغ' بھی کئی اعتبار سے جاذب توجہ ہے۔ اس نظم کا ڈرامائی انداز علامتی معنویت کا حامل ہے۔ اور یہاں شاعر نے روشنی، تاریکی اور ہوا کے استعاروں کی مدد سے نیکی اور بدی یا ظلم اور انسانی حوصلوں کی ازلی اور ابدی لڑائی کو مجسم کر دیا ہے۔ نظم کا اختصار اور فنی توازن بھی متاثر کرتا ہے۔ ڈرامائی عناصر کی آمیزش سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم فنی جہت اور یہ نظم اس طریقہ کار کی ایک عمدہ مثال ہے۔

علی سردار جعفری نے انڈو پاک دوستی اور امن عالم کے موضوع پر بھی متعدد نظمیں لکھیں، جن میں سے بعض مثلاً 'دشمن کون ہے' اور 'صبح فردا' بہت مشہور ہوئیں۔ ان نظموں کی افادیت اور جذبے کے خلوص میں شک نہیں، لیکن میرے خیال میں اس موضوع پر ان کی بہترین نظم 'گفتگو' کے ابتدائی اشعار:

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے

اب ہماری گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس نظم کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہ بیک وقت ایک سیاسی نظم بھی ہے اور عشقیہ نظم بھی اور اس کا عشقیہ پہلو ان اشعار میں کافی نمایاں ہے۔

صبح تک ڈھل کے کوئی حرف وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزش پا آئے گا
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

مقالے کی حدود سردار جعفری کی عشقیہ شاعری پر اظہار خیال کی اجازت نہیں دیتیں لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ یہ بھی سردار جعفری کے شعری اثاثے کا ایک قابل لحاظ حصہ ہے۔ اور اس میں کم سے کم ایک نظم، یعنی 'حسین تر' ایسی ہے جس کا شمار نہ صرف سردار جعفری کی بہترین نظموں میں بلکہ اپنے دور کی بہترین عشقیہ نظموں میں کیا جا سکتا ہے۔

سردار جعفری کی آخری دور کی شاعری میں 'نومبر میرا گہوارہ'، 'آبلہ پا' اور 'برہنہ فقیر' زیادہ اہم نظمیں ہیں۔ لیکن 'نومبر میرا گہوارہ' جو ایک منظوم خود نوشت ہے، نامکمل ہے اس لیے اس پر اظہار خیال مشکل ہے۔ باقی دو نظموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی۔ 'برہنہ فقیر' میں سردار جعفری نے وجود و عدم کے تصورات کو علامتی انداز سے پیش کیا ہے۔ یہاں عدم ایک برہنہ فقیر ہے اور وجود اس کا عارضی لباس۔ سورج، چاند، ہوائیں اور دشائیں سبھی اسے لباس فراہم کرتے ہیں لیکن:

"قبائے ظلمت و نور میں
کبھی چھپ سکا نہ وہ ہے بدن
اور انسانی زندگی جس کے ہزاروں رنگ ہیں اسے ہر روز ایک نیا پیراہن پہناتی ہے اور یہی 'وجود حکمت سادہ ہے"۔

یہاں سردار جعفری کا وجود و عدم کا تصور خاصا پیچیدہ ہے

www.taemeernews.com

اور میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہاں وہ کسی خاص فلسفۂ حیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ یا یہ مخصوص تصورات اور شعری پیکر ان کی ذاتی فکر کا نتیجہ ہیں۔

'آبلہ پا' اس سے زیادہ اثر انگیز اور دلکش نظم ہے، جس میں انسانی زندگی کو صحرا کے سفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور انسان کو وقت کا مہمان کہا گیا ہے۔ یہ سفر صعوبتوں سے پُر بھی ہے اور دلنواز بھی۔ مثلاً:

یہ وسعت میداں ہے
یا درد کا صحرا ہے
اک دھوپ کا جنگل ہے
یا پیاس کا دریا ہے

اور پھر:

ہے رات کی راہوں میں
تاروں کا سفر جاری
اور بادِ بیابانی
سرمست و غزل خواں ہے
ہر ذرّے کے سینے میں
اک شمع فروزاں ہے
ہر خار کے نیزے پر
خوابوں کا گلستاں ہے

اس طرح انسانی زندگی کا پیرہن امید و بیم، نشاط و الم، خواب اور حقیقت اور فطرت کی فیاضی اور حسن کی بے ثباتی کے تار و پود سے بنا ہے اور اس کی ہر کیفیت پراسرار ہے اور اس صحرائے بیکراں میں آوازِ جرس بھی بنتا ہے۔ اور آخر میں وقت کے تصور اور تسلسل حیات کو ان شعری پیکروں میں ڈھالا گیا ہے:

کل صبح کے دامن میں
تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر
کچھ نقش قدم ہوں گے
سائے میں درختوں کے
پھر لوگ بہم ہوں گے

یہ نظم گہرے تفکر، احساس کی شدت، اظہار کی ندرت، تہ دار معنویت، فنی وسائل کی کفایت، وژن کی وسعت اور ایک پراسرار کیفیت کے باوصف ایک مختصر شاہکار سے کم نہیں اور اسے سردار جعفری کے فن کی معراج بھی کہا جا سکتا ہے۔

علی سردار جعفری کی منتخب نظموں کے اس مختصر جائزے سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک خلاق، مفکر اور اوریجنل شاعر تھے جن کی شاعری کا کینوس اور فکر کا دائرہ کافی وسیع تھا اور ان کی فکری جہات متنوع اور ارتقا پذیر ہیں۔ پروشت کے جذبے اور انقلابی نظریے کے اظہار سے لے کر وسیع آفاقی وژن اور فلسفیانہ تفکر اور ماورائی احساس تک اس نے کئی مراحل طے کیے اور ہر منزل پر ان کی فکر والہانہ جذبوں سے سرشار رہی۔ شدت فکر و احساس، وژن کی وسعت اور اسلوب کی بلند آہنگی سردار جعفری کی شاعری کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں اور اگرچہ ان کا اندازِ فکر مجموعی طور پر رجائی ہے لیکن آخری دور کی شاعری میں اس رجائی انداز کی جگہ گہرے تفکر، تحیر اور داخلی تلاش نے لے لی ہے اور ایک المیہ عنصر بھی موج تہ آب کی طرح ان کی فکر میں مرتعش ہے اور یہاں بلند آہنگی کی جگہ شعری اسلوب میں جذبہ و فکر کی ایک گہری مگر مدھم آنچ ہے جو نور ہی نور ہے نار نہیں۔

سردار جعفری کی شاعری پر یہ اعتراض کہ وہ نعرے بازی یا تک بندی کے سوا کچھ نہیں تو صرف حاسدوں کے پراگندہ ذہن کی اختراع ہے۔ سردار جعفری شاعر ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ دانشور بھی تھے اور لیڈر شپ کی صلاحیتیں بھی ان میں خداداد تھیں۔ ساتھ ہی وہ ایک فعال اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے ان کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے ہمعصروں میں فیض احمد فیض کے علاوہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس لیے یہ کم عیار لوگ سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری دونوں پر چھینٹے اچھالنے میں مصروف رہے۔ جہاں تک کچھ اور الزامات کا سوال ہے مثلاً یہ کہ سردار جعفری کا شعری اظہار ضرورت سے زیادہ وضاحتی اور سپاٹ ہے تو یہ الزام بھی غلط ہے۔ سردار جعفری کی ابتدائی نظموں میں طوالت اور

www.taemeernews.com

پھیلاؤ ہے لیکن اکثر جگہ مثلاً 'پتھر کی دیوار'، 'ایشیا جاگ اٹھا' اور 'اودھ کی خاکِ حسیں' میں وہ موضوع کا تقاضا ہے۔ اور آخری دو نظموں میں تو یہ براہِ راست انداز ان کی دلکشی میں اضافہ ہی کرتا ہے۔ البتہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان کی شاعری کا ارتقائی سفر وضاحتی انداز سے اختصار، ارتکاز اور ایمائیت کی طرف تھا۔ اور ان کے دوسرے اور تیسرے دور کی شاعری میں تو فکر، جذبہ، موضوع اور فنی وسائل اس طرح ایک دوسرے سے ہم آمیز ہیں کہ ان کو الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جاسکتا ان کی متعدد معروف اور مقبول نظمیں، جیسا کہ اس جائزے میں کئی مرتبہ اشارہ کیا جاچکا ہے۔ اپنی فنی وحدت اور تہ دار معنویت میں طویل استعارے سے کم نہیں اور یہ خصوصیت 'میرا سفر'، 'سرطور'، 'پیرا ہن شرر'، 'حرفِ اول'، 'ہمارے نام'، 'دو چراغ'، 'قریب'، 'آبلہ پا' اور 'برہنہ فقیر' میں زیادہ نمایاں ہیں۔ اور آخری دو نظمیں تو انتہائی لطیف اور اظہار کی سادگی اور فنی وسائل کی کفایت کے باوجود گہرے تفکر اور فلسفیانہ تصورات کو اپنے دامن میں چھپائے ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری صرف انقلابی فکر اور اشتراکی نظریات کا بیان ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں تاریخی شعور کی گہرائی بھی ہے اور سائنٹفک وژن کی نور افشانی بھی اور انھوں نے صرف سماجی ناانصافی، معاشی نابرابری اور کشمکش اور انقلابی تحریکوں کی تصویر کشی ہی نہیں کی ان کے شعری سروکار میں موت، زندگی، وجود، عدم، وقت اور ارتقا جیسے پیچیدہ تصورات بھی شامل ہیں جن کو عام طور پر انھوں نے بے حد لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس کی کچھ عمدہ مثالیں 'میرا سفر' اور 'آبلہ پا' وغیرہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سردار جعفری کی شاعری بڑے کینوس اور وسیع وژن کی شاعری ہے جس نے فکر و احساس کے سبھی رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مہابیانیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں تک فنی خصوصیات کا سوال ہے تو سردار جعفری کی شاعری میں ابتدا ہی سے پیکر تراشی اور استعارہ سازی کی ندرت اور معنویت، مناسب بحروں کا استعمال، اور ان کا انفرادی لب و لہجہ اور آہنگ کچھ جاذبِ توجہ خصوصیات رہی ہیں۔ لیکن اس میں بھی ارتقائی کیفیت دیکھی جاسکتی ہے اگر ایک سرے پر 'نئی دنیا کو سلام' ہے تو دوسرے سرے پر 'برہنہ فقیر'، 'آبلہ پا'، 'حسین تر' اور 'میرا سفر' جن میں اختصار، ارتکاز اور ایمائیت ان کی تہہ دار معنویت کی ضامن ہے۔ اور ان آخری نظموں میں فنی وحدت اور تہہ دار معنویت اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہیں کہ انھیں طویل استعارے ہی کہا جاسکتا ہے۔

مختصراً سردار جعفری اپنے دور کے ایک اہم اور ممتاز شاعر تھے۔ اور اس دور میں ان کے قد و قامت کے شاعر صرف فیض احمد فیض، اختر الایمان اور ن۔ م۔ راشد ہیں، جو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی نسل کے شاعروں میں صرف مخدوم محی الدین ایسے شاعر تھے جن کی شاعری فکر و احساس کی شدت انھیں ایک بڑا شاعر بنا سکتی تھی لیکن وہ شاعری کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا شعری اثاثہ محدود ہے۔ اس نسل کے شاعروں میں اچھے شاعروں کی کمی نہیں مثلاً جذبی، مجاز، مجروح، ساحر وغیرہ لیکن یہ سب چھوٹے کینوس اور فنی یک رنگی کے شاعر تھے اور انھیں GOOD MINOR POETS ہی کہا جاسکتا ہے جب کہ سردار جعفری ایک میجر شاعر تھے اور فیض احمد فیض بھی اور گو کہ ان کی شاعری پوری طرح کمزوریوں سے پاک نہیں لیکن پھر بھی وہ MAJOR شاعروں کی تخلیق ہے۔ اختر الایمان بھی ایک میجر شاعر تھے اور ان کی شاعری میں بھی بڑی وسعت اور گہرائی اور تہہ داری ہے اور انھیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کی شاعری اس قسم کی کمزوریوں سے بھی پاک ہے جو سردار جعفری اور فیض احمد فیض میں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ بہر طور سردار جعفری کی رحلت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مستقبل قریب میں شاید ہی پُر ہو سکے کیوں کہ دوسرے میجر شاعر تو پہلے ہی رخصت ہو چکے ہیں۔

□□□

www.taemeernews.com

انسان دوستی
سردار جعفری کے کلام کا بنیادی محور

پروفیسر شارب ردولوی
A II-7، مورس نگر، دہلی 110069

سردار جعفری کی شاعری کلاسیکی اقدار اور ترقی پسند فکر کے خوبصورت امتزاج کی شاعری ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کی ادبی و شعری فکر کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ ان زاویوں کو نگاہ میں رکھے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ ہماری کلاسیکی روایت میں ایک بڑی روایت تصوف کی روایت رہی ہے، جس کا بنیادی محور وہ مثلث ہے جس کا ایک زاویہ خالقِ کائنات، دوسرا کائنات اور تیسرا زاویہ انسان ہے۔ فارسی کی وہ شاعری جو ہم نے ادبی اور تہذیبی روایت کے طور پر پائی اس میں بھی اس مثلث کی بڑی اہمیت ہے، جس نے انسان دوستی، محبت اور مساوات کو عقائد اور مذہبی روایات سے زیادہ اہمیت دی اور انسان سے محبت اور اس کے جذبات کے احترام کو ہی بہترین عبادت قرار دیا۔ سردار کی میرا اور کبیر پسندی کے پس پردہ بھی وہی انسان دوستی کا جذبہ کار فرما ہے جو ان کی شاعری کا جزو لازم ہے۔

ہماری کلاسیکی شاعری میں انسان کا تصور بالعموم ایک مجبور اور بے بس انسان کا تصور ہے جسے کوئی اختیار نہیں ہے اور جو مجبورِ محض ہے۔ وہ صرف زندگی کا بوجھ اٹھا کر چلنے والا ایک بے بس انسان ہے لیکن ترقی پسند فکر نے اس نئے انسان کا تصور دیا جو مجبور ہونے کے ساتھ باغی بھی ہے اور اپنی تقدیر خود بنانا چاہتا ہے، جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کائنات کو زیادہ خوبصورت زیادہ دلکش اور زیادہ حسین بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہی انسان سردار کی فکر کا مرکز و محور ہے۔ آج انسان علم کے نئے نئے دروازے وا کرتا جا رہا ہے اور رازہائے تخلیق سے ہر روز نئے پردے اٹھاتا جا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی جو خدا کے قائل نہیں ہیں، خالقِ کائنات کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور ساتھ ہی انسان کی ہنرمندی کا پرچم بلند کر رہا ہے۔ سردار انسان کی اسی عظمت کے نغمہ خواں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیوں کہ تاتمامی فطرت کا اٹل قانون ہے لیکن اس منزل کا تصور، شوق کو مہمیز کرتا رہے گا اور انسان کو آدابِ خداوندی سکھاتا رہے گا۔"

سردار کے تصورِ انسان کو ان کے اس اقتباس سے بڑی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ تکمیلِ کائنات کے قائل نہیں۔ اس لیے کہ تکمیل ارتقا کی دشمن اور اختتام کی علامت ہے اور کائنات ارتقا کا نام ہے۔ یہاں پر غالب کا ایک شعر اس کی بڑی اچھی تفسیر پیش کر سکتا ہے:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

غالب نے بھی ارتقائے کائنات کے تسلسل کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور کائنات کے سلسلہ میں نئی دریافتوں کو 'آرائشِ جمال' سے تعبیر کیا ہے۔

سردار جعفری کے پہلے مجموعہ کلام 'پرواز' سے لے کر 'نومبر۔ میرا گیارہ' تک نصف صدی سے زائد کے شعری سفر میں ایک ہی جذبہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ انسان، اس کے کرب اور اس کے مسائل سے ہمدردی اور جذبۂ انسانیت ہے۔ انسان کی مجبوریوں کے بارے میں تقریباً سبھی شعرا نے کسی نہ کسی انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے لیکن ان کے یہاں وہ بہت سے موضوعات میں سے ایک موضوع ہے جو کبھی کہیں نظر آ جاتا ہے۔ سردار جعفری نے تسلسل کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اسے ان کے کلام کا بنیادی محور بنا دیا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی شاعری میں ایک باغی نوجوان نظر آتے ہیں جو عہد پارینہ کی داستانوں سے بھی بغاوت کرتا ہے

www.taemeernews.com

اور عظمتِ رفتہ پر رونے والوں سے بھی، جو حکومت سے بھی بغاوت کرتا ہے اور "سامراجی نظم و قانون وسیاست" سے بھی، جو دکھ درد کو برداشت کرنے والے جذبے سے بھی بغاوت کرتا ہے لیکن صرف ایک انسان ہے جس سے بغاوت نہیں کرتا:

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

دراصل انسان کی یہ بغاوت بھی ان کی انسانیت اور انسانوں سے محبت کی علامت ہے۔ اس لیے کہ جن باتوں سے وہ بغاوت کرتے ہیں انھوں نے ہی انسان کو مجبور و معذور بنا رکھا ہے اور اس سے ایک باعزت زندگی گزارنے کا حق چھین لیا ہے۔ یہ بغاوت بھی برائے بغاوت یا صرف ایک نعرہ نہیں بلکہ انسان کے دکھ درد سے ہمدردی کا جذبہ ہے۔ ان کی مشہور نظم 'نئی دنیا کو سلام' اردو شاعری میں ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں موضوع اور ہیئت کے ساتھ اظہار و بیان کے جو تجربے کیے گئے ہیں اور کلاسیکی لفظیات کو نئے مفاہیم اور نئی پیکر تراشی سے آراستہ کیا گیا ہے اس نے اس کے بیانیہ یا مقصدی ہونے کے باوجود اسے نئی شعری توانائی سے آراستہ کردیا ہے۔ اس نظم پر کوئی بھی اعتراض کیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے اردو شاعری میں وسعت اظہار کے کتنے ہی نئے دروازے کھول دیے۔ یہ نظم بھی بنیادی طور پر انسان کے فکر و عمل کی آزادی اور انسانیت کی بلند مثالی کو پیش کرتی ہے:

کتنی دلچسپ ہے یہ کہانی
مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی
ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے
اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بہتاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اور تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں پھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لیے گوندھتی ہے۔

(نئی دنیا کو سلام)

سردار انسانیت پر زبردست یقین رکھنے والے شاعر ہیں، وہ کبھی کسی عالم میں مایوسی یا ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری کوششیں صرف ایک حد تک کام کرتی ہیں اور اس کے بعد ہم نہیں رہتے۔ لیکن موت بھی ان میں کسی طرح مایوسی یا ناامیدی نہیں پیدا کرتی، وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کی تعمیر کا یہ سلسلہ ہمارے نہ رہنے کے بعد بھی اسی طرح چلتا رہے گا:

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آباء واجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی
زندگی کا فلک بوس ایواں اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صناعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صناع
اپنے فن اور صنعت کا آغاز کریں گے

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور افق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی۔

(نئی دنیا کو سلام)

ان کا یقین ہے کہ زندگی اور انسانیت کل بھی رنگ و نور کی دلکشی کی طرح یوں ہی باقی رہے گی اور اگر اس میں کوئی فرق آئے گا تو یہ آئے گا کہ آج جو غریبی کی ذلت، مصیبت، جہالت، عداوت کی زنجیریں انسان کو جکڑے ہوئے ہیں، وہ ٹوٹ جائیں گی اور زندگی کی مغموم آنکھوں میں خوشیوں کی روشنی چمکنے لگے گی۔

www.taemeernews.com

زندگی کا ایک مخصوص تصور بلکہ تسلسل زندگی کا تصور سردار جعفری کا محبوب ترین موضوع ہے۔ اس پر انھوں نے طرح طرح سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ بار بار نئے نئے استعاروں اور علامتوں میں اس بات کو دہراتے ہیں۔ انسان کے لیے موت کا خوف ہمیشہ ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوف رہا ہے۔ اس خوف نے نہ جانے کتنے توہمات پیدا کیے ہیں اور انسان ازل سے اس پر قابو پانے کے لیے کوشاں ہے۔ سردار موت کی حقیقت سے انکار نہیں کرتے لیکن تسلسلِ زندگی کا تصور دے کر اور بار بار اس کا ذکر کرکے وہ ذہنوں پر حاوی تصورِ مرگ اور خوفِ مرگ کو پسپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئے انداز میں زندگی کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں:

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفلِ جمیل
جس طرح ذہنِ ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طرب ناک تسلسل کی دلیل

ان اشعار میں شمع اور کنول کی خوبصورت رعایت ہی نہیں بلکہ بچے کے لیے کنول (پھول) کا استعارہ جو اس کی شادابی، دلکشی اور مسرت بیزی کا خوبصورت اظہار ہے، شعر کے جمالیاتی کیف کو دوگنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح آغوشِ مادر میں 'طفلِ جمیل' کے تبسم کی تشبیہ ذہنِ ازل میں ابد کی تخئیل سے دینا سردار کی انفرادیت کی بہترین مثال ہے۔

زندگی کے تسلسل کا تصور اردو شاعری کے لیے نیا نہیں ہے۔ بعض شعرا کے یہاں تلاش کرنے پر اس طرح کے شعر مل جائیں گے:

موت اک ماندگی وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

لیکن اس طرح کا اظہار بس رسماً آ گیا ہے۔ کسی نے اسے نہ تو اپنا موضوع بنایا، نہ اپنی فکر کے ایک اہم پہلو کی طرح پیش کیا اور نہ اسے جمالیاتی احساس اور جذبے کی بھرپور شدت کے ساتھ اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ اس موضوع پر صرف اردو ہی میں نہیں میرے خیال میں تمام ہندوستانی ادبیات میں سب سے اچھی نظم سردار جعفری کی "میرا سفر" ہے۔ اس کی امیجری اور اس کے استعارات، نظم میں خیال کا ارتقا اور بہاؤ اس قدر خوبصورت ہے کہ جیسے جیسے الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں ذہن میں ان کی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظم کے عنوان کے ساتھ سردار نے رومی کا مصرع 'ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم' درج کیا ہے۔ یعنی رومی کے اس خیال کو لے کر انھوں نے زندگی کے وسیع کینوس پر حیات و ممات کی رنگ آمیزی کی ہے۔ اس کی امیجری اور خوبصورت استعاروں کے ذریعہ تسلسل حیات اور زندگی کے فلسفہ کو سردار جعفری کس طرح پیش کرتے ہیں، چند اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

اس زمین پر جب سے زندگی کا وجود ہوا ہے اور جب سے حیات انسانی کی کونپلیں اس سے پھوٹی ہیں، زندگی اور موت کا سلسلہ جاری ہے۔ اور آج تک کوئی اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھا سکا ہے کہ اس انسان کو اپنی ذہانتوں، علمی سربلندیوں، بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود اچانک کیا ہو جاتا ہے اور وہ کہاں چلا جاتا ہے اور اس کے بعد جو تاریکی ہے اس میں کیا ہے۔ لیکن سردار زندگی کے ختم ہو جانے کے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں یہ اسی طرح چلتی رہتی ہے اور ہر اختتام دراصل ایک نئی شکل میں نمودار ہوتا ہے:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

www.taemeernews.com

جب بیج بنسیں گے دھرتی میں
جب کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں کھولوں گا

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی

(میرا سفر)

اس پوری نظم میں جن استعارات سے سردار نے پیکروں کی تشکیل کی ہے وہ شعری اظہار پر ان کی قدرت کی مثال ہیں لیکن نظم کی اس جمالیاتی دلکشی کے ساتھ اس غیر دلچسپ موضوع کو شعری وسیلۂ اظہار میں بدل دینا بھی سردار ہی کا حصہ ہے۔ زندگی کے لامتناہی سلسلہ کو یہ استعاراتی زبان اور یہ تشبیہیں سردار ہی دے سکتے تھے:

میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں

سردار کے لیے سب سے عظیم چیزیں انسان اور انسانیت ہیں۔ وہ اسی کے نغمہ خواں ہیں اور اسی کی زندگی کی بات کرتے ہیں جو محرومیوں کا شکار ایک عام انسان ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ زندگی اس وقت تک حسین کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی جب تک عام انسان کو مظلومی اور جبر سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ 'امن کا ستارہ' میں وہ اسی انسان کو اپنا "آدرش" اور دین و ایمان بتاتے ہیں۔ ان کی وہ نظمیں جن میں براہِ راست اس موضوع کا ذکر نہیں ہے ان میں بھی استعارات اور علامتیں اسی انسانیت، محبت، صلح جوئی کی خواہش کی طرف اشارہ ہیں اور اسی کے لیے وہ اس 'صبح فردا' کے منتظر ہیں جو صرف محبت کا پیغام سنائے اور جو بارود کی بو کے بجائے پھولوں کی خوشبو بکھیر دے۔ یہ نظم بھی اپنے موضوع کی اہمیت کے ساتھ جمالیاتی اظہار کا بے حد پر اثر نمونہ ہے:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

یہ سرحد صرف 'گلشن لاہور و دلی' کی سرحد نہیں بلکہ اس میں ہر اس سرحد کا درد پوشیدہ ہے جس پر ہر روز نوجوانوں کے تازہ خون سے رنگ بھرا جاتا ہے اور یہ نظم انسان دوستی اور محبت کی وہ آرزو ہے جو سرحدوں کو پھول کی خوشبو اور رنگوں کی بہاروں سے بھر دے اور اسے کج اداؤں، کج کلاہوں، منچلوں، دلبروں اور عاشقوں کی سرحد بنا دے۔ انسانیت کا یہ نغمہ خواں سرحدوں پر کب سے اس صبح کا انتظار کر رہا ہے۔

سردار کا سب سے بڑا دکھ انسان کا مصائب و آلام کا شکار ہونا ہے جس کا سبب سماجی اور معاشی نابرابری، ناانصافی، نفرت اور ہوس ہے۔ انسان کا انسان پر یہ جبر صرف کسی نظام حکومت کی بات نہیں ہے اور نہ اس کے بدل جانے سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انسان کی تقدیر بدل جائے گی۔ کسی نظام کی تبدیلی سے کچھ ناانصافیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے، اس کی زندگی نہیں بدل سکتی۔ ہمارے سامنے ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کی پچاس سالہ تاریخ ہے۔ اس عرصہ میں مجبوروں کے لیے استعمال ہونے والی بعض اصطلاحات ضرور بدل گئیں لیکن ان کی حالت نہیں بدلی۔ آج سردی ہو یا گرمی

www.taemeernews.com

فٹ پاتھ پر سونے والوں کی تعداد پہلے سے کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔ آج رنگ و نسل اور ذات پات کے جھگڑوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ آج ظلم کے حربے اور زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ سردار انسان کی اس بے بسی کے خلاف آواز کا نام ہے جو انسان کی افسردہ شاموں کو خوشگوار بنا دینے والے کو اپنا دل نذر کرنے کو تیار ہیں:

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو
صبح تبسم عطا کرے
پیاس کے پیلے برگ خزاں کو
فصل گل کی مے میں ڈبو دے
کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے
آنسو کے قطرے چن لے

جو دھرتی کی بھوک مٹائے
اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں سے بھر دے
انساں کی تفریق مٹا کر
انساں کی تخلیق کرے
کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر
میرے خوابوں کا یہ عکس ملے

(چھوٹا سا دل، لہو پکارتا ہے)

اس سلسلہ میں سردار جعفری نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت 'پیراہن شرر' حرفِ اول میں جن الفاظ میں کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سماجی ناانصافی یا سماجی نظام کی تبدیلی انسانی فطرت کو نہیں بدل سکتی جس میں ہوس اور خود غرضی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کے لیے ذہنوں اور فکروں کو بدلنے اور ان کے تعصبات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"... معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساس برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

سردار نے اسی فکر اور ذہن کو تبدیل کرنے اور ان میں نفرتوں کی جگہ محبتوں کے گلاب کھلانے کی کوشش کی جو ان کے کلام میں ہر جگہ استعارے اور علامتیں بدل بدل کر در آئی ہے۔ وہ کل پر یقین اور اپنی کوششوں پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر کوشش کے پیچھے ایک نئی تازگی اور ایک نئی توانائی نظر آتی ہے اور وہ پہلے سے اور زیادہ خوش رنگ اور دلکش الفاظ میں اپنی بات دہراتے جاتے ہیں:

امانت غم انساں امانت غم دل
یہ اک چراغ ہے قندیل مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

یہ گل جو درد محبت امانت غم ہے
یہ گل جو شوخ بھی خوں گستہ بھی ملول بھی ہے
خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

زندگی اور انسان سے یہی محبت سردار کی شاعری میں دلنوازی کی نہ جانے کتنی شکلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ 'اودھ کی خاک حسین' میں یہی محبت کہیں سیاہ چکی سے سفید آٹے کے راگ بن کر نکلتی ہے اور کہیں 'سنہری چولہوں میں آگ کے پھول' کھلنے میں نظر آتی ہے:

سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہری چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

زندگی سے ایسی والہانہ محبت اور اس کے رنگوں کی ایسی تصویر کشی، ایسی متحرک اور دلکش امیجری اردو شاعری میں کمیاب نہیں نایاب ہے۔ سردار کو اپنے موضوع کے اظہار پر جو قدرت اور اظہار کی جمالیات پر جو گرفت ہے وہ ان کی نظموں کو ایک تازک اور لطیف احساس میں تبدیل کر دیتی ہے، موضوع ان کا خواہ کچھ بھی ہو۔ □□

www.taemeernews.com

اودھ کی خاکِ حسیں

(ایام اسیری کی ایک خوبصورت نظم)

زبیر رضوی

۷۔ کاسموپارٹمنٹ، اسٹریٹ نمبر 12، ذاکر نگر، نئی دہلی 110025

دنیا کی ہر زبان میں قید خانے یا زنداں میں تخلیق پانے والا ادب، گنج گراں مایہ کی صورت میں موجود ہے خواہ نثر ہو یا شاعری، قید خانے کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جو کچھ لکھا گیا اس کا چرچا بھی خوب ہوا اور اس میں کافی کچھ ایسا بھی تھا جو ادب کی مختلف کسوٹیوں پر کھرا اترتا رہا۔ ہندوستانی ادب میں بھی ایسے ادب کی خاص طور سے شاعری میں کمی نہیں رہی جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے احتجاج، مزاحمت اور باغیانہ جذبے کے ساتھ لکھا گیا ہو اور جو جیل سے باہر کی فضا میں جبر اور ظلم کی طاقتوں کے خلاف ہندوستانی ذہن و فکر کو صف آرا ہونے اور پیکار کے محاذوں کی تشکیل کرنے کی تحریک دینے میں معاون بنا ہو۔ اردو شاعری کے تین ممتاز شعری مجموعے قید خانے ہی کی دین ہیں۔ ان شعری مجموعوں نے اردو شاعری کی ترقی پسند فضا کو متاثر کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ فیض کا شعری مجموعہ 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' اور علی سردار جعفری کا مجموعہ 'پتھر کی دیوار' قید ہی کے دنوں میں لکھے اور ترتیب دیے گئے۔ ان دونوں شاعروں کی قید و بند کی داستان اور اس کے اسباب بڑی حد تک مختلف ہیں لیکن ان دونوں شاعروں کا تعلق چوں کہ ترقی پسند تحریک اور رجعت پسند طاقتوں کے خلاف صف آرائیوں سے تھا اس لیے ان کی شاعری میں انقلاب، مزاحمت اور جبر و ظلم کے ماحول کو بدل دینے کی غیر معمولی خواہش اور تڑپ پائی جاتی ہے۔ باغی اور انقلابی اسی لیے پس زنداں ڈال دیے جاتے ہیں کہ چلتی پھرتی، سانس لیتی زندگی میں ان کی موجودگی آتش گرما اور بم کے دھماکے جیسی ہوتی ہے۔ جبر اور استبداد کے دنوں میں سماج کے کمزور اور مزاحمت سے عاری عوام کو شاعر کی نوا غیر معمولی حوصلہ اور صلابت عطا کرتی ہے۔ اسی لیے خوف زدہ حکمراں طبقہ زبان پر پابندی لگا دیتا ہے اور روشنی دیتی ہوئی آوازوں کی لوئیں کتر ڈالتا ہے۔ زنداں ایک باغی اور انقلابی کی پیر کی زنجیر ضرور بن جاتا ہے اور سرگرم تحریکوں اور جیالے عوام سے اس کا جسمانی ربط تو ختم کر دیتا ہے لیکن شاعر اور اس کے عوام دوست قاری کے درمیان فکری اور ذہنی سطح پر رشتہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جب فیض کی کوئی نظم / غزل منٹگمری جیل سے یا سردار جعفری کی کوئی نظم ناسک جیل سے خفیہ پیاموں کے ذریعہ باہر آتی تھی تو وہ تخلیق جنگل کی آگ کی طرح میڈیا کے ذریعہ حرزِ جاں بنالی جاتی تھی۔ فیض نے اسی لیے تو کہا تھا:

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

یا بقول غالب:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اور یہ پابہ زنجیر دیوانوں کی جنوں سامانی اور شوریدہ سری ہی تھی کہ ان کی آواز پہ کان لگے رہتے تھے:

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

اردو شاعری میں محفل کی طرح مقتل کا یہ تجربہ زنداں اور دیوار زنداں کا ذکر کہیں تقلیدی رہا تو کہیں تخلیقی۔ فیض، علی سردار جعفری، مخدوم اور مجروح کے یہاں زنداں کی واردات ایک بیتی ہوئی واردات ہے۔ ان شاعروں کے نزدیک جیل جانا ایک ایسا معنی خیز تخلیقی تجربہ تھا جس نے ان کی شاعرانہ سوچ کو

www.taemeernews.com

ایک نئی جہت سے آشنا کر دیا۔ فیض نے زنداں کے اس تجربے کو اور مقتل سے سرشوریدہ لے کر گزرنے کے تجربے کو غیر معمولی تخلیقی انہماک اور سرشاری کے ساتھ برتا۔ سردار جعفری بھی پتھر کی دیوار میں قید و بند کے اس تجربے سے کچھ ایسے ہی سرشار ہیں۔ فیض زنداں سے پرے اپنا روشنیوں کا شہر بھی دیکھ لیتے ہیں اور اپنے اس شہر کی گلیوں پر جی بھر کے نثار بھی ہوتے ہیں۔

زنداں کی صبح اور شام ان پر ناسٹلجیا کے بے شمار در باز کرتی ہے۔ فیض کی نظم "دریچہ" اور سردار جعفری کی نظم 'پتھر کی دیوار' بڑی حد تک ظلم کے خلاف ایک شدید ردِ عمل کی دین ہیں۔

اسی طرح 'اے روشنیوں کے شہر' اور 'نثار میں تیری گلیوں' کی طرح سردار جعفری کو بھی ان بیتے ہوئے دنوں کی یاد آتی ہے جب وہ اودھ کی خوبصورت شاموں میں ہجومِ یاراں اور حلقۂ میگساراں میں زندگی کی بخششوں کو جی بھر کے لٹاتے تھے۔ فیض جب اپنے ماضی، اپنے شہر، اپنے یاروں اور اپنے گھر، اس کے در و بام اور گلیوں کو یاد کرتے ہیں تو ان کا لہجہ گھلاوٹ میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ اشاریت اور ایمائیت کے سہارے پیکر تراشی کرتے ہیں:

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو
(اے روشنیوں کے شہر)

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں
(نثار میں تیری گلیوں کے)

فیض کے برخلاف جعفری ایمائیت سے زیادہ صراحت بیاں کے قائل ہیں۔ ان کی شعری لفظیات اور پیکر تراشی بھی فیض سے مختلف ہے۔ 'پتھر کی دیوار' میں جعفری کی ایسی نظمیں زیادہ ہیں جو ان کے شاعرانہ قامت کو درازی عطا کرنے میں بڑی معاون رہی ہیں۔ ان میں ان کی سب سے خوبصورت نظم 'اودھ کی خاکِ حسیں' ہے۔ یہ نظم بیتے ہوئے میں پھر سے سفر کرنے اس کی تمام تر لطافت، حلاوت، شادابی اور رومانس کو پھر سے اپنی گرفت میں لینے کی غیر معمولی تڑپ سے عبارت ہے۔ زنداں کی تنہائیوں میں اپنوں کی، اپنے اسلاف کی، یاروں کی، اپنے شہر، گاؤں، قصبے کی اس کے موسموں کی، ماں باپ کی شفقتوں اور بھائی بہن کے رشتوں کی، باغی شاموں اور انقلاب آفریں راتوں کی، میخانوں اور میگساروں کی، آزادی کے سورماؤں کی یاد بے حد ستاتی ہے اور جب یہ سارا بیتا ہوا یاد آتا ہے تو بڑی شدت سے یاد آتا ہے اور تب شعری اظہار کی توانائی بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ خیال، جذبے اور احساس کا ساتھ دیتی ہوئی دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ نظم میں یادوں کا رواں دواں یہ سفر اپنے پڑھنے والوں پر جذب و کیف کے عجب عجب منظروں کو رنگوں سے بھگو دیتا ہے:

مرے تصور میں ساقیوں کا خرام رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں / نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں / میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں / اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں / وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں۔

پوری نظم بیتے ہوئے جلال و جمال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ نظم کیا ہے یوں لگتا ہے جیسے کسی بڑے کینوس پر بنائی ہوئی ایک بے حد معنی انگیز تصویر ہے۔ اس نظم میں شاعر کا خیال بڑا رواں دواں ہے کہیں دھوپ گھر کی منڈیروں پر پر سکھانے لگتی ہے تو کہیں سارا منظر ساون بھادوں کی پھواروں میں بھیگنے لگتا ہے۔ کہیں موسم دھومیں مچاتا ہے اور کہیں قدرت اپنے ہزار رنگوں کے ساتھ آنکھوں میں اتر آتی ہے:

میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں

www.taemeernews.com

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھالوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگادوں۔

یہ حکمراں طبقے کا بھرم ہوتا ہے کہ کسی باغی یا انقلابی کو قید میں ڈال کر وہ عوامی تحریک کو کمزور کرنے کا یقین کر لیتا ہے۔ مگر زنداں کی دیواروں سے پرے انقلاب اور بغاوت کا وہ منظر آنکھ اوجھل نہیں ہوتا۔ جس پاداش میں زنداں کی زنجیر مقدر بنی اس سے شاعر کا ذہنی اور جذباتی تعلق اسی طرح برقرار ہے۔ وہ چاہتا ہے کسان مزدور اپنی تحریکوں کو زندہ رکھیں:

اودھ کی خاک حسیں کے ذرے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں
غموں کی بھاری سلیں دلوں سے سرک رہی ہیں
شجاعتیں گو پھنوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جھکے ہوئے سر ابھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے

شاعر نئی عوامی بغاوتوں کا ترجمان ہے وہ چاہتا ہے:

چمن کے پھولو! چمن میں اک آگ سی لگادو
لچکتی شاخو! فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو! ہوا میں جوالا مکھی اچھالو
ملوں کے بھپو! بغاوتوں کے ترانے گاؤ
سحر کی کرنو! اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشاں مٹادو

نظم یقین اور امید کی مشعلوں کو فروزاں کرتی ہوئی دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے کہ وہ فیض ہوں یا سردار جعفری، مجروح ہوں یا مخدوم۔ عوام دوست تحریکوں میں ان کا ایقان متزلزل نہیں ہوتا۔ نئے انسان اور اس کی سماجی توقیر سے ان کا سروکار قید و بند کے ہر دشوار اور سخت مرحلے پر لچکتا اور ٹوٹتا نہیں ہے۔

مخدوم نے جیل میں کہی ہوئی اپنی خوبصورت نظم 'قید' کو اس طرح ختم کیا تھا:

مجھے غم ہے کہ میرا عجز گراں مایۂ غم
نذر زنداں ہوا
نذر آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

اودھ کی خاکِ حسیں کا زندانی نظم کے آخری مصرعوں میں اپنے اس یقین کو دہراتا ہے کہ بھلے ہی سنگ و آہن نے اس کی زباں بندی کر دی ہے اس کے آگے دیواریں اور سلاخیں گاڑ دی ہیں مگر اس کے دل میں بغاوت اور ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے مضطرب جوالا مکھی کو دبایا نہ جاسکے گا۔ اپنی مجاہدانہ صلابتوں پر یہی اعتماد اس پوری نظم کا محور ہے:

مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کوئی دبا سکا ہے
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

□□□

اکادمی کے مشاعرے میں علی سردار جعفری ساتھ میں جناب زبیر رضوی اور پروفیسر وحید اختر کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

www.taemeernews.com

وطن گلاب

بیکل اتساہی

بلرام پور، یوپی

اتر پردیش کے شمال مشرقی علاقے میں گونڈہ ضلع واقع ہے جو صدیوں فکر و فن، شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ لوک کتھاؤں میں گونڈہ شری رام کے پتر 'لو' کا گوچر تھا، جہاں گونڈ قبیلے کی آبادی رہی۔ اسی ضلع میں بڑے عظیم شاعروں اور فنکاروں نے جنم لیا جس میں گوسوامی تلسی داس، پانچالی، گھاگھ، سنت تلسی داس (ہنومان چالیسہ کے مصنف) برم بھٹ (جہانگیر کا درباری کوی) جگت داس کے نام روشن ہیں۔ یہیں اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، مرزا شوق، خواجہ مسعود حسن ذوقی نے اپنا مسکن بنایا اور یہیں کے ہو کر رہے۔

ضلع گونڈہ کے شمالی اور ترائی علاقے بلرام پور واقع ہے جو چھتری راجاؤں کی جاگیرداری رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں راجہ بلرام سنگھ نے اسے آباد کیا اور تغلق بادشاہوں کے باغ گزار رہے۔ راجہ جے سنگھ کے زمانے راج دربار میں صنف نازک فنون، شاعری، موسیقی، مصوری، وغیرہ کو بڑا وقار حاصل رہا۔ راجہ خود اردو کا شاعر بھی تھا۔ اپنے دربار کی زینت کے لیے اس نے مانک پور سے خلیل مانک پوری (حضرت جلیل مانکپوری کے بڑے بھائی) لکھنؤ سے انیس کے خاندان سے نوشہ بھیا آگرہ سے جعفری گھرانے کے ذہین و متین لوگوں کو بلا کر بلرام پور میں آباد کیا جن میں سید حیدر کرار جعفری کو اپنے انتظامیہ میں اسسٹنٹ مینجر کا عہدہ دیا۔ سید صاحب کے دو اور بھائی سید احمد مختار جعفری اور سید جعفر طیار جعفری تھے جو ریاست کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔

سید جعفر طیار کی حویلی (جو کوٹھی سید صاحب کہلاتی تھی) میں ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء میں ایک چاند اگا جس نے دنیا کو روشنی دی۔ اس کا نام علی سردار جعفری رکھا گیا۔ حویلی خوشیوں کا مرکز بن گئی۔ محلہ بقعۂ نور سے جگمگا اٹھا۔ ریاست نے بھی اس موقع پر راج دربار میں جلسۂ مسرت کا اہتمام کیا۔ سردار اپنے بچپن میں ہی سید صاحب کی کوٹھی کے دلارے رہے اور اپنی شرارت سے حویلی میں شب و روز جگمگاتے رہتے تھے۔ حویلی کے پاس مدرسہ احمدیہ میں قرآن اور زبان اردو فارسی کے درس کے لیے داخل کیے گئے۔ قرآن، گلستاں بوستاں، آمدنامہ کی فراغت کے بعد ریاست کے اہم کالج لائل کالجیٹ میں انگریزی و دیگر علوم کے لیے داخل کیا گیا، کالج میں اپنی کم عمری ہی میں علی سردار جعفری نے اپنے ہم سبق طلبا میں فوقیت کا درجہ رکھتے تھے۔ کالج کے کسی بھی شعری، تقریری پروگراموں میں حصہ لیتے، ممتاز رہتے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے سردار آزادیٔ وطن اور سامراجیت کے خلاف سوجھ بوجھ رکھتے، ایک باوقار اور جاگیردارانہ نظام کے گھرانے کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے غریبوں، کسانوں، مزدوروں کے ساتھ ہی رابطہ رکھتے۔ شہر اور علاقے میں اسٹوڈنٹس لیڈر کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں انٹرنس پاس کر کے کالج سے نکل کر گھر پر رہنے لگے۔ ۱۹۳۳ء میں شہر کے مشہور مجاہد آزادی کے آماجگاہ پر سردار نے اپنی تقریر میں انگریزوں کے خلاف سفید ہاتھی کا نعرہ دیا اور انگریزوں کو اکسا کر انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کا نعرہ دیا۔ اس پاداش میں سردار کو جیل بھیج دیا گیا۔ چوں کہ گھرانہ بارسوخ تھا اس لیے جلد ہی سردار کو جیل سے نکال لایا گیا اور حویلی سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ سردار کے گھر کا ماحول مذہبی رہا۔ دین کے خلاف کوئی بات سننا کفر تھا۔ سردار نے اپنے نظربند رہنے کے اوقات میں

www.taemeernews.com

مرثیے، نوحے، سلام و منقبت خوب خوب کہے اور مجلسوں میں پڑھا بھی۔ پھر کیا کہنا شہر میں ان کا کلام دہرایا جانے لگا۔ بڑی عزت و احترام سے سردار سب کے لیے محبوب ہوگئے۔ والدین نے سردار کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیجا، وہاں ان کی ملاقات خواجہ احمد عباس، اختر رائے پوری، سبط حسن، مجاز اور جذبی سے ہوئی۔ یہ سب کے سب ترقی پسند ادب کے راہبر و تھے، ان سبھی کا ساتھ ملا تو سردار جعفری کی شاعری اور سیاسی زندگی میں نکھار آنے لگا۔ سردار جعفری وہیں پہلے راہبر بنے پھر کارواں اور پھر رہبر کارواں کا درجہ لے لیا۔ وہاں یونیورسٹی کے طلبا کو ہڑتال پر اکسانے کی سزا میں نکال دیے گئے۔ اب سردار جعفری علی گڑھ سے دہلی آپہنچے اور اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی اے پاس کر کے لکھنؤ آگئے جہاں ایم۔ اے میں داخلہ لیا اور کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ سرگرم کارکن ہوگئے اور آزادیِ وطن، انگریزوں کے ظلم و تشدد، سامراجیت کے خلاف اندولن شروع کر دیا۔ دبے کچلے سماج کے لیے اپنے قلم سے الکھ جگایا۔ پھر ۱۹۴۲ء میں بمبئی جا کر اپنی تحریک میں مصروف ہوگئے اور سیاسی، سماجی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور فلمی سرگرمیوں کی امامت کرتے رہے۔ علی سردار جعفری اب فرد نہیں انجمن بن چکے تھے۔ ان کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت سے ان کے ہمنواؤں، ہمسفروں کو فائدہ پہنچنے لگا اور ترقی پسند ادب کو گیرائی ملی۔ ان کے فکر و فن کے اتنے پہلو ہیں کہ کسی بھی پہلو پر اظہارِ خیال کے لیے وقت اور صفحات درکار ہیں۔

اُن کی شاعری کا آغاز مرثیہ گوئی سے ہوا پھر افسانہ نگاری ۱۹۳۸ء میں افسانوں کا مجموعہ 'منزل' شائع ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں شعری مجموعہ 'پرچم' ان کے علاوہ 'پرواز'، 'خون کی لکیریں'، 'پتھر کی دیوار' ۱۹۴۸ء میں 'نئی دنیا کو سلام' ۱۹۵۰ء میں، 'امن کا ستارہ' ۱۹۵۱ء میں، 'ایشیا جاگ اٹھا' شائع ہو کر خواص و عوام مقبول ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں سوویت یونین نہرو ایوارڈ، ۱۹۶۷ء میں 'پدم شری'، ۱۹۷۸ء میں اقبال سمان، ۱۹۸۶ء ٹور نٹو یونیورسٹی سے اردو ایوارڈ، ۱۹۹۸ء گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

علی سردار جعفری کے تنقیدی، ادبی، شعری نظریات پر پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ ان کی اہمیت نقاد سے زیادہ ترقی پسند تحریک کے مورخ کی ہے لیکن جہاں انھوں نے مارکسی نظریات کے اثرات اردو ادب میں تلاش کیے ہیں وہیں ان اصولوں کا ذکر بھی کیا ہے جن کے تحت ادب کو دیکھنا چاہیے۔ ان کے وہ خیالات کسی حد تک تنقیدی اصول بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اُن کے نظریات اور اسلوب سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ انھوں نے ادب کو طبقاتی جنگ کا ایک آلہ کہا ہے اس میں ان کا انداز میکانکی اور کسی حد تک انتہا پسندانہ ہے۔ سردار کا کہنا ہے کہ ادب کے مسائل وہی ہیں جو زندگی کے مسائل ہیں۔ ادب کے موضوعات بھی زندگی کے موضوعات سے الگ نہیں ہو سکتے۔ دوسری جگہ کہتے ہیں وہ ادب ماضی کی روایت کے تسلسل کے باوجود نیا ہوگا جو جذبات کو متحرک کر سکے گا اور دل و دماغ پر اپنے حسین جادو کی کمند پھینک سکے گا تب ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی کونپلیں مزدوروں کی زندگی سے پھوٹ رہی ہیں۔

سردار جعفری کے قابل ذکر مضامین کبیر بانی، دیوانِ غالب اور دیوانِ میر کے مقدمات ہیں جو پچھلے چند برسوں میں لکھے گئے ہیں جن میں ان کے تنقیدی اور تحقیقی افکار میں وضاحت اور توازن ہے اور جو سائنٹفک تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہیں۔ اپنے ان مقدمات میں انھوں نے عملی طور پر جس اصول پر زور دیا ہے وہ فنکار یا ادب کے نظریات اور عقائد کو دیکھنا اور اس کے ماخذوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ یہ مقدمات اردو تنقد کے سرمایے میں بہت اہم ہیں جو اردو کی سائنٹفک ترقی پسند تنقید کو آگے بڑھانے کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں"۔

سردار جعفری کے ان نظریات و عقائد کے باوجود ان کا مطالعہ بہت عمیق و وسیع ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں رومی، حافظ اور میر تقی میر کے فکر و فن کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکی شاعری کے رموز و علائم بھی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ مذہبی روایات و تلمیحات بڑے احتیاط کے ساتھ اپنایا ہے، مذہبی اور سماجی ریاکاری سے انحراف کیا ہے اور ملک و سماج کی معیشت کو زوال کی طرف جاتے دیکھا وہیں ان کا قلم چیخ

www.taemeernews.com

اٹھا۔

اکثر بلرام پور کے لوگوں کا سردار جعفری پر الزام رہا ہے کہ سردار نے اتنا نام کمایا اتنی عزتیں بٹوریں مگر بلرام پور کے لیے کیا کیا۔ میرے خیال سے یہ بھی محبت اور احترام کی ایک علامت ہے۔ میں ان کے نزدیک ۱۹۵۴ء۔۱۹۵۵ء سے آیا اور برابر ان سے بلرام کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا تو سردار بھائی کو ایک نامعلوم کرب میں ڈوبا پایا۔ جب خاموشی ٹوٹی تو وہ بلرام کی زمین و زبان، بولی ٹھولی، اپنے ہم سبق لوگوں کے نام، گلی کوچوں، بازار و دکانوں کا بے ساختہ تذکرہ کرنے لگتے اور کبھی کبھار ان کا گلا رندھ جاتا بلرام پور کو یاد کر کے۔ میں نے کئی بار اصرار کیا بھائی صاحب اب بلرام پور چلیے اور وہیں سکون سے رہیے اپنی حویلی، کھیتی باڑی دوست احباب کو ہنسنے مسکنے کا موقع دیجیے۔ ۱۹۸۴ء میں اہل بلرام پور نے جشن سردار جعفری منانے کا پروگرام مرتب کیا جس میں مجھے صدر انتظامیہ اور جناب کیفی اعظمی کو صدر استقبالیہ نامزد کیا، جس میں بمبئی سے سردار بھائی کے ساتھی ایک ریلوے کوچ لانے پر آمادہ ہوئے۔ چترا، جگجیت اور دیگر غزل گائکوں نے بلا فیس شرکت کا ارادہ کیا مگر چند ناگزیر حالات کی بنا پر یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

جب سردار بھائی ۱۹۷۶ء میں میرے پدم شری ایوارڈ پانے کے جشن میں شرکت کرنے آئے تو انھوں نے اپنی تقریر میں بلرام پور کی سرزمین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جو کام ادب کا مجھے کرنا تھا میرے چھوٹے بھائی پدم شری بیکل اتساہی نے کر دکھایا۔ یہ بھی کہا کہ میری نصیحتوں، ہدایتوں پر بیکل اتساہی اردو ادب مقامی بولی اودھی بھوجپوری کے خوبصورت الفاظ کو غزل جیسی نازک اور حسین صنف میں استعمال کر دکھایا جس میں غزل کے اسلوب و لہجہ کو کہیں سے ٹھیس نہیں پہنچا۔ اردو ادب میں گیتوں کا سلسلہ پرانا سہی عظمت اللہ، مقبول احمد پوری، محبی حفیظ جالندھری نے اردو میں ہندی بحروں اور روایات کو اپنایا مگر بیکل اتساہی نے میری نصیحت پر گیتوں کو اردو بحروں میں نظم و غزل کا پیراہن دیا ہے۔ ان کا نام اردو ادب میں زندہ رہے گا۔ یہ تھی ان کی بلرام پور کی زمین سے حد درجہ محبت اور لگاؤ۔

اردو اکادمی کے ایک مشاعرے میں جناب علی سردار جعفری کے ساتھ جناب مخمور سعیدی، جناب بیکل اتساہی، جناب بشیر بدر اور دیگر شعرا کو دیکھا جا سکتا ہے۔

آج وہ ہم سے بہت دور چلے گئے جہاں سے اب واپس نہیں آئیں گے۔ بلرام پور کی سرزمین رنج و غم میں ڈوب گئی۔ بازاروں، گاؤں میں سناٹا چھا گیا۔ ہر فرد کی زبان پر 'ہمارا سردار ہم کو چھوڑ گیا اکیلا ہی' آہ کے ساتھ ورد زبان ہے اہل بلرام پور نے اب جب سردار بمبئی کی سرزمین میں سپرد خاک ہو چکے تو ان کے نام سے کسی عظیم ادارہ کا قیام اور جس کالج میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی اس کے کیمپس میں دو ہزار سیٹوں والی کمیونٹی ہال بنانے کا تہیہ کر لیا ہے اور تحریک شروع ہو چکی ہے۔ میٹنگوں پر میٹنگیں جاری ہیں۔ تعمیر میں خرچ ہونے والی رقم کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

جلد ہی ان کی شریک حیات محترمہ سلطانہ بھابھی جو سردار بھائی کی پرسنالٹی بلڈنگ کی عظیم ترین انجینئر ہیں کو بلرام پور بلا کر سنگ بنیاد رکھوانے کی درخواست کی جائے گی۔ مشیت سردار بھائی کو اپنی جوار رحمت میں رکھے اور ہمیں ان کے مشن کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔□□□

www.taemeernews.com

مجھ سے نظریں چُرا کے کہاں جاؤ گے؟

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

C-307 سوربھ، سیون بنگلو، اندھیری (ویسٹ) ممبئی 400058

کوئی درخت کتنا مضبوط اور چھتنار ہے، یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سواد سایہ کی پیمائش کی جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ اس میں کتنی شاخیں ہیں۔ کتنے بوگ و بار آئے ہیں۔ اس نے کتنے موسموں کو جھیلا ہے اور اس کی جڑیں اپنی زمین میں کتنی گہرائی تک پیوست ہیں۔ سردار جعفری کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ایک مضبوط اور چھتنار درخت کی مانند بدلتے موسموں کا ہر وار سہتی ہوئی، ہر رُت میں تر و تازہ سرسبز شاداب، زندہ و تابندہ۔ ساتھ اور پاس کے درختوں کی سازشوں سے بے نیاز۔ آندھیوں اور طوفانوں کی عیاریوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ مطمئن و مستحکم۔ گرد و غبار اور خس و خاشاک کی گستاخیوں پر خنداں و تبسم فشاں۔ اور ننھے چوزوں اور کیڑے مکوڑوں کی شرارتوں اور بوڑھے، گھاگ حشرات الارض کی خباثتوں سے محظوظ و شاداں۔

آخر سردار جعفری کی شخصیت کا وہ راز کیا تھا جو انھیں مخالفت اور حسد و رقابت کی سیاہ آندھیوں میں بھی کسی ہرے بھرے شجر کی طرح سربلند و راسخ رکھے ہوئے تھا؟ جس نے ان کے مخالفین کو بھی اتنا بزدل بنا دیا تھا کہ 'خود کو آسانی سے مشہور کرنے' کی خواہش میں اگر کوئی انھیں گالیاں بھی دیتا تو بہت جلد اپنی ہجو سننے کے ڈر سے جعفری صاحب کی مدح سرائی میں قصیدہ لکھنے پر یوں مجبور ہو جاتا گویا کسی گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہو۔ میں جب بھی جعفری صاحب کے بارے میں سوچتی ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتی ہوں کہ ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ دوست تو دوست دشمن بھی ان کی صلاحیتوں کے دل سے قائل تھے اور ان کی بے پناہ شخصیت سے مرعوب و خائف بھی۔ شاید یہ اس مخصوص ماحول کا نتیجہ تھا جس نے انھیں بچپن ہی سے ایک منفرد انداز میں جینا سکھایا تھا۔

وہ مخصوص ماحول کیا تھا؟ — شمالی ہند کا ایک خوب صورت قصبہ۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کے دامن میں بسی ہوئی ایک تعلقہ داری کی راجدھانی۔ اور اس خوبصورت بستی کا ایک دل کشا محلہ۔ جہاں سرخ بجری کی روش، ٹینس کورٹ، عشق پیچاں کی بیلیں، مہندی کی باڑھ، بیلے اور چمپا کے پودے اور اس قصبے کا سب سے اونچا نیم کا درخت تھا۔ اودھ کی خاک حسیں پر آباد — وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں والا ایک عالی شان مکان — کہ جہاں ہر بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے ہم قافیہ تاریخی نام سے اپنے خانوادے کے شعری ذوق کا اعلان کرتا نظر آتا تھا۔ اور قافیے بھی کیسے دھانسوں تھے! احمد مختار، حیدر کرار، جعفر طیار وغیرہ۔ شاید اسی لیے اس خاندان کے کسی بزرگ کے ایک زندہ دل اور بے تکلف دوست نے از راہِ مذاق کہا تھا: 'اب تمھارے کوئی اور بیٹا پیدا نہ ہو تو بہتر ہے۔ کیوں کہ آگے قافیہ تنگ ہے اور اس وزن کا ممکنہ صرف ایک نام — 'پاک پروردگار' باقی ہے۔" مگر — اسی پاک پروردگار کا فضل و کرم دیکھیے کہ اس خاندان میں پھر ایک بیٹا پیدا ہوا تو 'قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند' والے خواجہ حافظ نے روحانی مدد فرمائی اور اس کے ایک قصیدے سے نومولود کے نام کا مسجع نکل آیا:

علی امام و علی سرور و علی سردار

علی سردار جعفری کے لیے بلرام پور کی یہ کوٹھی ہی وہ آرٹ گیلری تھی جہاں ان کے ذہن کے کینوس پر مختلف رنگا رنگ تصویریں اپنے نقوش ثبت کرتی رہیں۔ ان کے والدین، بھائی، بہن، چچا، مولانا سبطِ حسن، قرآن پڑھانے والے مولوی صاحب، کسان اور ان کی مظلوم عورتیں، ہرواہے اور ہرواہیاں، زمین دار اور ٹھیکیدار، اسکول ماسٹر منشی بدری پرشاد، معذور لقوہ زدہ میر بق چوں چوں، تحصیلدار التجا حسین، استخارہ نکالنے والے مجتہد صاحب اور محمد جیسا باوفا ملازم۔ بچپن اور لڑکپن انہی جیتے جاگتے کرداروں کے درمیان

www.taemeernews.com

گزرا۔ یہ خاندان اودھ کی مخصوص مشترکہ تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ سردار جعفری کی شخصیت اور فن اسی مخصوص ماحول اور تہذیب کی دین تھی۔ جو ان کے ہر لفظ سے، ہر ادا سے جھلکتی تھی۔ یہاں تک کہ زنداں کی فضاؤں میں بھی وہ اسی ماحول کی تصویریں اپنے ذہن میں سجاتے اور بناتے رہے:

ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں

سفید آٹا سیاہ چکّی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولھوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں

اور اس کے بعد یہ خواہش کہ — 'جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں' — 'ہزار بوسوں سے جگمگا دوں'!!

اودھ کی اس حسین زمین ہی کی طرح ان کی شخصیت کی رنگا رنگی کا بھی یہ عالم تھا کہ آخری سانس تک ایک جسم میں بیک وقت کئی روحیں جاگزیں رہیں۔ بحث و تمحیص کے میدان کا فاتح، یاروں کا یار، قدردانوں کا قدردان، ذوقِ جمال کا آئینہ بردار، میر و میرا کا مزاج داں، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نمائندہ، حافظ و کبیر کا عاشق، حب الوطنی کا پیکر، انسان دوستی کا مبلغ، اشتراکیت کا شیدائی اور سودائی، ایک سنجیدہ صحافی، اسٹیج ڈراموں کا خالق، افسانہ نگار، ترجمہ نگار، کلاسیکی ادب کا مدوّن کار اور سب سے بڑھ کر ایک بالغ نظر مفکر اور دانشور۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح اودھ کی سرزمین کے عظیم سپوت انیس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ —

گلدستۂ معنی کو عجب ڈھنگ سے باندھوں
اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اُسی طرح یہ تعلّی بھی اودھ ہی کے اس ذہین فرزند کو سجتی تھی کہ:

اس محفلِ صد رنگ میں سو رنگ ہیں میرے
ہر رنگ میں رقصاں ہوں گلستانِ جہاں میں

خوشبو کی طرح کاکلِ پیچاں کی گلی میں
شعلے کی طرح انجمنِ شعلہ رخاں میں
شمشیر بکف لشکرِ اعدائے وطن میں
پیمانہ بکف محفلِ پیمانہ کشاں میں
کانٹے کی طرح دیدۂ اربابِ ستم میں
سُرمے کی طرح چشمِ حسینانِ جہاں میں

اور ان سب رنگوں میں ان کا ایک اپنا انفرادی رنگ موجود رہا۔ یہاں تک کہ ادبی مناقشات و اختلافات میں بھی ان کی ذات اپنا ایک الگ انداز رکھتی تھی۔ وہ اس نظریے کے قائل تھے کہ:

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے

واقعی ان کی شخصیت ایک کاہکشاں تھی۔ سات رنگوں سے عبارت۔ مگر دیکھیے تو ایک ہی رنگ — سفید — سپیدۂ سحر کی طرح روشن، تاباں، درخشاں اور ضوفشاں۔

اور پھر مزاج کے مختلف پہلو — 'کرشمہ دامنِ دل می کشد' کی کیفیت لیے ہے۔ اسپورٹس میں لاابالی پن کا یہ عالم کہ بغیر کسی پریکٹس کے کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس میدان میں اترے اور بقول تصور علی حیدر دو چار انٹ شنٹ شارٹ مارنے کے بعد مہارت دکھائی اور میچ جیت کر کالج کے سنگلز چمپئن بن بیٹھے۔ نفاست پسندی کا یہ حال کہ دسترخوان پر دھبہ پڑ جاتا تو اس کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی بہن ستارہ آپا کے مطابق اگر رکابی میں گوشت کی بوٹی ٹوٹ جاتی تو فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیتے۔ متانت ایسی کہ بدگوئی بالکل پسند نہ کرتے۔ کسی کے فن پر کوئی رائے دینا تو خیر الگ بات ہے، اس میں تو وہ خود بھی بے باک تھے، لیکن اگر کوئی شخص ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی غیبت کرتا تو اس کو برداشت نہ کرتے اور فوراً اسے ٹوک دیتے یا کسی بہانے اس گفتگو کا وہیں خاتمہ کر دیتے۔ بے نیازی ایسی کہ بقول یوسف ناظم، اسٹیج پر چڑھنے اور مائکروفون کی طرف دوڑنے کی کبھی ہوس نہ کی۔ ایفائے عہد اس حد تک کہ کسی جلسے یا تعزیت میں شرکت کی منظوری دے دی تو ہر حال میں بذاتِ خود بغیر کسی قیل و قال، مانگ یا طلب کے وقتِ مقررہ پر جلسہ گاہ میں حاضر۔ فیض رسانی کا حال تو یہ کہ وہ لوگ جو انھیں پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے، ضرورت پڑنے پر خود ان کے در پر دستک دیتے اور جعفری

www.taemeernews.com

صاحب سب کچھ جانتے ہوئے بھی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے۔ ان کی ضرورتیں پوری کرتے اور انھیں ممکنہ حد تک فیض پہنچاتے اور لطف یہ کہ کبھی زبان پر نہ لاتے، نہ کسی کو خبر ہونے دیتے۔ مرنجان مرنج طبیعت ایسی کہ ہر کسی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ کسی کو ناراض نہ ہونے دیتے اور اس اقدام کو 'دفعِ شر' کا نام دیتے۔ غرضیکہ عجیب شخصیت تھی سردار جعفری کی۔ شاید ان کے مزاج کے انھی پہلوؤں کو دیکھ کر عرفانہ عزیز انھیں 'نیلا فرشتہ' خیال کرتی تھیں۔ مگر ــــ

سردار جعفری کی ہمہ رنگ شخصیت اور ان کے فن کے ہمہ جہت پہلوؤں کے اعتراف کے باوجود مجھے یہ تسلیم کرنے میں قطعی عار محسوس نہیں ہوتی کہ جعفری صاحب فرشتہ نہیں تھے۔ انھیں فرشتہ گردانا عقیدت مندانہ مبالغے سے زیادہ ان کے مرتبے کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ وہ انسان تھے اور انسانیت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ وہ آدمی تھے اور آدمیت کے تمام اوصاف ان میں موجود تھے۔ یعنی جملہ بشری خوبیاں اور خامیاں ان کی ذات کا بھی ایک حصہ تھیں۔ عام آدمیوں کی طرح کچھ کمزوریاں ان میں بھی خاص طور پر رہی ہوں گی۔ انھوں نے بھی یقیناً کچھ غلطیاں کی ہوں گی کہ یہی آدمیت کی دلیل ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے ادبی دورِ عروج و اقتدار میں انھوں نے اپنے شرکائے کار اور ہم نشینوں کے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہوں، جن کے سبب ان کے کچھ ساتھی ان کے شاکی ہو گئے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ یہ شکایتیں سر تا سر بے جا نہ ہوں گی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جتنے معتوب رہے، اس سے کہیں زیادہ محبوب رہے۔ اتنے محبوب کہ کچھ تو محض ان کی چاہت میں مارے گئے۔ اور اپنے خیر خواہوں کو بھی اپنا بدخواہ بنا دیا اور کچھ دیوانے ان کی حمایت میں اردو اکادمی کی چیئرمین شپ اور رکنیت تک سے مستعفی ہو گئے۔ انھوں نے بعض صنعت کار گھرانوں کی تشاعرات کے شعری مجموعوں پر طویل دیباچے بھی تحریر کیے اور ان کا افتتاح بھی فرمایا جن کی وجہ سے کچھ سنجیدہ لوگ ان سے ناراض ہوئے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام لگایا۔ ہو سکتا ہے کہ ذاتی مفادات جعفری صاحب کے بھی پیشِ نظر رہے ہوں کیوں کہ وہ بھی منشی پریم چند، غالب اور 'طائرِ لاہوتی' کو 'پرواز کی کوتاہی' کی تنبیہ کرنے والے علامہ اقبال کی طرح بہر حال ایک آدمی ہی تھے۔ ان کی زندگی بھی چند مسائل سے دوچار تھی۔ دو کنواری بہنوں کی ذمہ داری، جو عمر بھر ان کے ساتھ رہیں۔ اُن اولادوں سے دوری جو ان کی طرح دانشور یا ادب کا کوئی بڑا نام نہ بن سکیں، شہر، بیرونِ شہر اور بیرونِ ملک سے آنے جانے والے اعزہ، اقربا، ادبا، شعرا اور احباب و ارباب کی مہمان نوازی، اس کے علاوہ بھی اندرونِ خانہ وہ مسائل جن کا علم صرف سلطانہ آپا ہی کو ہو سکتا تھا۔ بیرونِ خانہ افراد صرف 'بھانپ' سکتے تھے، جان نہیں سکتے تھے اور نہ حقیقت کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے۔ ورنہ ان کے فلیٹ کی، جس کے وہ OWNER بھی نہ تھے، قیمت نہ آنکتے اور نہ ہی خود ساختہ قانونی مشیر بن کے انھیں فلیٹ بیچ کر اپنے مسائل پر قابو پانے کا مفت مشورہ دیتے۔ بہر حال اتنا ضرور تھا کہ بمبئی کے غریب مزدوروں کی بستی مدن پورے کی گلی میں بچھی ایک شکستہ چارپائی سے شہر کے متمول علاقے وارڈن روڈ کی پختہ عمارت 'سیتا محل' کے فلیٹ تک کا سفر انھوں نے آسانی سے طے نہیں کیا تھا۔ وہ زندگی کی وادیِ پرخار میں آبلہ پائی کے کرب سے گزرے تھے۔ ہر چند کہ ان کی باوفا اور باحوصلہ شریکِ حیات سلطانہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں آیا تو کچھ منزلیں سہل ضرور ہو گئیں مگر راہ میں چراغ جلتے جلتے ان کے پاؤں میں کئی آبلے پڑ چکے تھے۔ پاؤں کے ان آبلوں سے گھبرا کر ممکن ہے انھوں نے بھی کہیں مفاہمت کی گھنی چھاؤں میں پناہ لی ہو۔ یا مصلحت کوشی کی خنک راہ میں کچھ دیر کے لیے ستانے کی کوشش کی ہو۔ اور کہیں نہ چاہتے ہوئے بھی مفاد کی خاطر غالب کی طرح اپنی انا کا سودا کیا ہو، مگر اس میں تعجب کیا؟ انا اور شکستِ انا اور خارجی حالات کے پیدا کردہ یہ داخلی تضادات تو ہر بڑی شخصیت کا مقدر ہیں اور ہر 'انسان' کی پہچان۔ انسان، جو خدا کو بھی عزیز ہے، پیارا ہے۔ شاید اسی لیے جعفری صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اپنے بعد آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیتے ہوئے ــــ کہ:

میری آواز پتھر میں شعلہ ہے
شعلے میں شبنم
اور طوفاں میں طوفاں
اور تمھارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے
سچ کہو
آنے والے زمانے کی روشن کتابو!
مجھ سے نظریں چرا کے کہاں جاؤ گے؟؟

□□□

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری کی یاد میں

سلام بن رزّاق

۱۱/۹ ایل۔ آئی۔ جی کالونی، ونوبا بھاوے نگر، کرلا (ویسٹ) بمبئی

ابھی چند روز قبل اردو کے منفرد غزل گو شاعر جناب مجروح سلطان پوری کے غم میں آنسو بہانے والوں کے آنسو خشک بھی نہیں ہو پائے تھے کہ یکم اگست ۲۰۰۰ء کی صبح کو علی سردار جعفری کی موت کی خبر نے اردو زبان و ادب کے شیدائیوں کو سکتے میں ڈال دیا۔

علی سردار جعفری پچھلے ستر برس سے اردو ادب کے افق پر ایک روشن ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ترقی پسند شاعروں میں فیض کے بعد انھیں کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے اور آخری دم تک اس تحریک سے وابستہ رہے۔

وہ مارکسی نظریے کے حامل تھے اور اپنی شاعری کو عوام کی بہبود کے لیے استعمال کرنے کے قائل تھے۔ انھوں نے شاعری نہیں کی بلکہ اپنے قلم سے جبر و استحصال، ناانصافی اور تشدد کے خلاف جہاد کیا ہے۔ ایک دانشور کی حیثیت سے انھوں نے ایک بہتر سماج کا خواب دیکھا اور شاعر کی حیثیت سے عمر بھر اس خواب کی عکس بندی کرتے رہے۔

بعض شخصیتیں اس قدر مقبول ہوتی ہیں کہ وہ اکثر عوام کے درمیان موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اپنی زندگی میں ہی ایک LEGEND کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جعفری صاحب کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی شاعری، ان کی گفتگو، ان کی تقریریں، ان کے مضامین، ان کی فلمیں یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا معمولی سے معمولی فقرہ بھی فوراً موضوع بحث بن جاتا تھا۔ یقیناً اس کا سبب ان کی غیر معمولی مقبولیت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جعفری صاحب میرے لیے بھی شروع سے ایک ہیرو اور آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں جب ہائی اسکول میں پڑھتا تھا ان کی نظم 'زندگی کا ترانہ':

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نصاب میں شامل تھی۔ طلبہ اس نظم کو بڑے جوش و خروش سے پڑھتے تھے۔ انھیں دنوں جعفری صاحب کی مشہور نظم 'ایک خواب اور' ہماری زبان میں شائع ہوئی تھی۔ غالباً یہ ۱۹۵۸ء کا زمانہ تھا۔ مجھے یاد ہے اس نظم پر کوئی مفتی حریر باپوڑوی صاحب اور وارث کرمانی صاحب نے دست بریدہ میں گلاب، تشنگی آبلہ، شعلہ بکف، موج سراب جیسی تراکیب پر کچھ اعتراضات اٹھائے تھے۔ اپنے آئیڈیل شاعر پر یہ اعتراضات مجھے ناگوار معلوم ہوئے۔ میں نے جذبۂ عقیدت سے مغلوب ہو کر جعفری صاحب کی حمایت میں ہماری زبان کو ایک مراسلہ داغ دیا۔ آل احمد سرور صاحب ہماری زبان کے مدیر تھے۔ اس وقت میں کیا اور میرا مراسلہ کیا، مگر خلاف توقع وہ مراسلہ ہماری زبان میں شائع ہو گیا۔ مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ کئی دن تک اس کا سرور قائم رہا۔ اور ہفتوں ہماری زبان کا وہ شمارہ بغل میں دبائے گھومتا رہا۔ جعفری صاحب کو تو شاید وہ بات یاد بھی نہ رہی ہو مگر وہ مراسلہ میری فائل میں آج بھی محفوظ ہے۔

غالباً ۶۵۔۱۹۶۴ء میں پہلی بار جعفری صاحب کو پونا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی شخصیت کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ بمبئی میں رہتے ہوئے بھی ایک عرصے تک ان سے ملنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جلسوں اور مشاعروں میں انھیں دور دور سے دیکھتا، سنتا اور دل ہی دل میں

www.taemeernews.com

غالب کا یہ مصرعہ دوہراتا رہتا تھا:

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر

جعفری صاحب اکثر تقریر کرتے ہوئے اپنے لمبے بالوں کو اپنی فرخندہ پیشانی سے اس ادا سے سرکاتے تھے کہ ایک تصویر سی کھنچ جاتی تھی۔ نوجوانوں کو ان کا یہ اسٹائل بہت پسند تھا۔ اس زمانے میں دو شخص کے بال بہت مشہور تھے۔ عوام میں دلیپ کمار کے اور ادبی حلقے میں جعفری صاحب کے۔ ہمارے ایک شناسا نے جنھیں شاعری سے تھوڑا شغف تھا۔ جعفری صاحب کی تقلید میں انھیں کی طرح لمبے لمبے بال رکھ لیے۔ ہم اسے اکثر رسول حمزہ کی نظم کا ایک ٹکڑا سنا کر چھیڑا کرتے تھے کہ 'تم نے لیو ٹالسٹائی کی طرح ایک ٹوپ تو خرید لیا ہے مگر اس جیسا سر کہاں سے لاؤ گے۔"

جعفری صاحب سے قربت سب چاہتے تھے مگر ان کی شخصیت میں کچھ ایسا رعب، کچھ ایسا کھ رکھاؤ تھا کہ ان سے قریب ہونے کی جرأت کم ہی لوگ کر پاتے تھے۔ مگر جب کوئی ان سے ایک بار مل لیتا تھا ان کی سحر انگیز شخصیت کا جادو، ان کا دلنواز طرزِ گفتگو اور ان کے بصیرت افروز خیالات سے ایسا متاثر ہوتا کہ عمر بھر پھر انھیں کا دم بھرتا رہتا۔

بعض کا خیال ہے کہ جعفری صاحب کی شخصیت میں 'نرگسیت' کا عنصر شامل تھا۔ نیز یہ کہ انھوں نے کبھی کسی کو پروموٹ نہیں کی۔ ادب میں کوئی کسی کو پروموٹ نہیں کرتا۔ یہاں پروموشن انھیں کو ملتا ہے جو اپنی ٹھوکروں سے راہ کے روڑے ہٹاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔ ویسے میرا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ جعفری صاحب اپنے سے چھوٹوں سے بھی نہایت محبت سے ملتے تھے۔ گھر جاؤ تو ہزار مصروفیت کے باوجود بیٹھ کر پوری دل جمعی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ واپسی پر کبھی لفٹ تک تو کبھی دروازے تک پہنچانے آتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک بار مہاراشٹر کالج میں کوئی ادبی نشست تھی۔ جعفری صاحب اور ظ۔ انصاری صاحب بھی مدعو تھے۔ کسی نے نشست کی صدارت کے لیے جعفری صاحب کا نام پیش کیا۔ جعفری صاحب نے انکار کرتے ہوئے کہا" بھئی آخر ہم لوگ کب تک صدارت کرتے رہیں گے، نئے لوگوں کو بھی آگے آنا چاہیے۔"

پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

"میں اس نشست کی صدارت کے لیے سلام بن رزاق کا نام پیش کرتا ہوں۔"

ظ۔ صاحب نے تائید کی اور خاکسار کو صدر بنا دیا گیا۔ وہ نشست میری زندگی کی یادگار نشست تھی۔

ایک بار میں نے ممبئی میونسپل کارپوریشن کے اساتذہ کے جلسے میں انھیں مدعو کیا۔ انھوں نے فون پر ہی دعوت قبول کر لی۔ تشریف لائے اور تعلیمی مسائل پر ایسا پُر مغز لیکچر دیا کہ کارپوریشن کے اساتذہ آج بھی بڑے جوش و خروش سے اس لیکچر کا ذکر کرتے ہیں۔ مجھے اردو اکیڈمی میں دو سال تک ان کی ہم نشینی کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ ان دو سالوں میں انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا۔

یہ روایت رہی ہے کہ ہر بڑے ادیب اور شاعر پر بعض کج فہم اور کم سواد لوگوں نے بے بنیاد قسم کی نکتہ چینیاں بھی کی ہیں۔ غالباً اس کا ایک بڑا سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر بڑا ادیب یا شاعر اپنے قارئین کا آئیڈیل یا ہیرو ہوتا ہے۔ بعض لوگ اسے تقریباً مافوق البشر ہستی سمجھنے لگتے ہیں لہٰذا اس کی معمولی سے معمولی خامی کو بھی خواہ مخواہ محدب شیشے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ فنکار بھی انسان ہوتے ہیں ان میں بھی چھوٹی موٹی خامیاں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں عظیم انسانوں کے عظیم کارناموں پر نظر رکھنی چاہیے۔ تنقید کرنے کے لیے پہلے ہمیں خود اپنا قد بلند کرنا چاہیے، ورنہ للّی پُٹ کے بونوں کی طرح خواہ مخواہ کی نشتر زنی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ: "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔

جعفری صاحب کی نظمیں، غزلیں، مضامین اور تقریریں ہمیں امید، رجائیت اور روشن مستقبل کا پیغام دیتی ہیں۔ جعفری صاحب کے ادبی کارناموں کا جائزہ لینے کے لیے دفتر درکار ہے۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر تھے، ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ ہمارے نقادوں نے ان پر لکھتے ہوئے بخل سے کام لیا ہے۔ اس کا شکوہ جعفری صاحب کو بھی تھا۔

ان کی شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس سے بھی کم ان کی نثر پر لکھا گیا ہے۔ جب کہ ان کی نثر نے ادب میں ایسے چراغ

www.taemeernews.com

روشن کیے ہیں جن کی روشنی میں آنے والی نسلیں ایک طویل مسافت طے کر سکتی ہیں۔ پیغمبران سخن، ترقی پسند ادب، اقبال شناسی، لکھنؤ کی پانچ راتیں ان میں سے ہر کتاب کو عصری اردو ادب میں کلاسیکیت کا درجہ حاصل ہے۔ بالخصوص لکھنؤ کی پانچ راتیں، اردو یادنگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جعفری صاحب نے معمولی باتوں کو بھی اپنی نثر کے جادو سے غیر معمولی بنادیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلی رات میں مجاز کے گیت کے بول "بول اری او دھرتی بول، راج سنگھاسن ڈانواں ڈول" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون سے پہلے بھی ہم سب نے وہ نظم پڑھی ہوگی مگر جعفری صاحب نے اس انداز سے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے پس منظر میں وہ نظم اردو کے ہر قاری کے ذہن پر ایک انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہے۔

اسی طرح ان کا ایک افسانہ یا افسانہ نما پورتاژ 'چہرو ما نجھی' اپنی خوبصورت نثر اور دلپذیر ماجرے کے سبب ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں اردو افسانے کے افق پر کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت آپا چھائے ہوئے تھے مگر جب ہم 'چہرو ما نجھی' کو ان بڑے افسانہ نگاروں کی تحریروں کے سیاق میں رکھ کر دیکھتے ہیں تو یہ افسانہ ہر اعتبار سے ایک شاہکار افسانے کے معیار کو چھوتا نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ اس عہد کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی پس منظر میں آج بھی ایک کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ 'چہرو ما نجھی' ہنوز ایک عمدہ تجزیے کا متقاضی ہے۔

جعفری صاحب کے خطوط کے چند اقتباسات جو 'گفتگو' کے ترقی پسند ادب نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ عمدہ ترین نثر کا نمونہ ہیں۔ یہ خطوط انھوں نے سلطانہ آپا کو لکھے تھے۔ خطوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں اُس عہد کے سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ اس عہد کی ادبی فضا کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جدید فکشن میں رمز و استعارے کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ جعفری صاحب نے اپنی نثر میں جگہ جگہ استعارات اور علامات کے ایسے موتی بکھیرے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۷ ستمبر ۱۹۴۹ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"جب سے اخبار میں بمبئی کی سوغاتی بارش کی خبر پڑھی تمھارے خط کا انتظار کر رہا تھا۔ ناسک میں بھی خوب بارش ہوئی یہاں کی تتلیاں اور پروانے بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ ان کے پر کے رنگ اور نقش و نگار بہت ہی نازک ہیں۔ رات کو بجلی کی روشنی میں دیواروں اور میز پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے ریشمی جسم اور پر چاندی اور سونے کی طرح جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں۔ میں نے کئی تتلیاں تمھارے لیے پکڑ رکھی ہیں۔ دیکھنا وہ کتنی حسین ہیں۔ ایک تتلی کا مجھے بڑا افسوس ہے۔ میں رات کو بستر پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا کہ وہ اڑتی ہوئی آئی اور بجلی کے قمقمے کے گرد چکر لگانے لگی۔ اس کا بدن سرخ تھا اور پر کالے جن پر سنہرے نقش تھے۔ وہ اڑتے وقت زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر ایک سگریٹ کی ڈبیا میں بند کر لیا۔ صبح اسے دیکھنے کے لیے ڈبیا کھولی تو وہ پھر سے اڑ گئی، لیکن جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی بہت سی چڑیاں اس کی طرف لپکیں وہ چڑیوں کو کئی غوطے دے کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں ایک کوا آیا اور اسے چونچ میں دبا کر اڑ گیا۔ میں کئی رات سے انتظار کر رہا ہوں لیکن ویسی تتلی پھر نہیں آئی۔"

کیا یہ پوری عبارت استعاراتی انداز بیان کی بہترین مثال نہیں پیش کرتی۔ خاطر نشان رہے کہ یہ خط ۱۹۴۹ء میں جیل سے لکھا گیا تھا۔ ہندوستان آزاد ہو کر تقسیم کے عذاب سے گزر چکا تھا۔ بائیں بازو کے دانشوروں نے اس لہولہان آزادی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ فیض صبح آزادی کو شب گزیدہ سحر کا نام دے چکے تھے۔ اس پس منظر میں یہ پوری عبارت اس عہد کی سیاسی صورتِ حال کا استعارہ بنتی نظر آتی ہے۔

اس مختصر سے تاثراتی مضمون میں جعفری صاحب کی نثر پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ چند سطریں محض خراج عقیدت کے طور پر پیش کر دی گئی ہیں۔ علی سردار جعفری ایک شخص کا نہیں ایک عہد کا نام تھا، سچ تو یہ ہے کہ ان کی رحلت کے ساتھ اردو زبان و ادب کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

□□□

www.taemeernews.com

وہ زندگی کی بشارتوں کا نقیب شاعر!

(علی سردار جعفری کی وفات پر)

عبدالاحد ساز

یہ زندگی کا رجز، یہ لمحوں کے بے کراں سلسلوں کا نغمہ
یہ جذب و فکر و شعور کی چلمنوں سے چھنتے ہوئے
زمانوں کی شاعری ہے

قلم سے نکلے ہوئے ستارے
اندھیرے کاغذ کے آسماں پر فسانۂ نور لکھ رہے ہیں
لبوں سے پھوٹے ہوئے شرارے
شکستہ روحوں کی انجمن میں نئی توانائیوں کا دستور لکھ رہے ہیں
یہ علم و دانش کے طاق و محراب سے مزین
جمیل نظموں کی درس گاہیں
نشیبِ ذلت کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے واسطے سربلند،
اشعار کی پناہیں
سفینۂ دل، خیال کا موجزن سمندر۔
نگاہ کے بادبان کی سمت آشنائی
مشاہدوں، تجربوں کے طوفان میں نظریوں کی رہنمائی
حروف اندر حروف جذب و جنوں کی تہذیب پل رہی ہے
کہیں پہ ذوقِ جمال پیکر تراشتا ہے
کہیں پہ سوز و گداز کی شمع جل رہی ہے
کہیں ہنر کے بدن میں افکار کی توانائی ڈھل رہی ہے
وضاحتیں ہونٹ چومتی ہیں
روانیاں گنگنا رہی ہیں
بلاغتیں لفظ کی فضا میں طلسمِ معنی جگا رہی ہیں

بدلتے موسم کی ساری سفاکیوں میں کشتِ سخن ہری ہے
یہ سوزِ تخلیق کا ترانہ، خروشِ پیہم کی شاعری ہے

وہ زندگی کی بشارتوں کا نقیب، زندہ روایتوں کا امین شاعر
دل و نظر اپنے پڑھنے والوں کے نام لکھ کر
اک الوداعی سلام لکھ کر
ہماری محفل سے جا چکا ہے
حیات و قوت کا وہ رجز خواں
جو اپنی باتوں میں اک دبستاں
جو اپنے قدموں میں کارواں تھا
جو اپنے لفظوں میں ایک عہدِ طلب کی پر شوق داستاں تھا
جو اپنے 'دستِ جنوں میں شمعِ خرد' اٹھائے
سفر میں اک مضطرب صدی کے
بساطِ فن پر رواں دواں تھا!

□□□

محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی، 84 چکلہ اسٹریٹ، ممبئی 400003

www.taemeernews.com

''نئی دنیا کو سلام'' اور علی سردار جعفری

ڈاکٹر علی جاوید
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

''نئی دنیا کو سلام'' نہ صرف علی سردار جعفری کی ذہنی تازگی کی ایک بہترین مثال ہے بلکہ ان کے ذہنی جدت طرازی کا ایک اعلیٰ ادبی نمونہ بھی۔ یہ طویل نظم اس وقت وجود میں آتی ہے جب اردو کی ادبی روایت میں آزاد نظم کو کوئی ادبی مقام حاصل نہیں ہوا تھا اور آزاد نظم کی تاریخ میں سردار جعفری نے یہ پہلا تخلیقی تجربہ قاری کے سامنے پیش کیا تھا۔ یعنی اردو شاعری کی تاریخ میں اس طرح کے ہیئتی تجربے یکسر معیوب تھے۔ ظاہر ہے اس جوکھم بھرے اقدام کا اندازہ خود سردار کو بھی تھا۔ مختصر سے پیش لفظ میں انھوں اس بات کا اعتراف بھی کیا اور دعویٰ بھی کہ ''اردو زبان میں اس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی ہے''۔ خود آگہی ان کی شخصیت کا ایک ناگزیر جزو ہے۔ ادبی انکسار کے تحت وہ اپنے ناقدین کو اختلاف کا موقع تو دیتے ہیں لیکن اپنے مفروضے پر قائم رہتے ہوئے کسی طرح کے سمجھوتے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ خود اعتمادی کی اسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عدم نے کہا تھا:

غرور مے کشی کی کون سی منزل ہے یہ ساقی
کھنک ساغر کی آواز خدا معلوم ہوتی ہے

اسی لیے سردار جعفری کہتے ہیں'' یہ نظم پیش کرتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک ہو رہی ہے۔ جھجک کی وجہ خود اعتمادی کی کمی نہیں بلکہ نظم کا نیا پن ہے۔ کیوں کہ اس سماج میں ہر نئی چیز شک اور شبہ کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے اور تکنیک بھی نئی''۔ اور بھی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زندگی سے متعلق میرا زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعرا سے مختلف ہے، اس لیے میں نے اکثر اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں کا وقت بھی کبھی آجائے گا۔''

اس نظم کے تعلق سے سجاد ظہیر کی 'روشنائی' سے یہ واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

''اردو اور ہندی کی بنیادی قربت کا اندازہ اور اس بات کا تجربہ کہ ہندی داں عوام کو اردو سے مغائرت نہیں ہے (بشرطیکہ انھیں غلط بیانیاں کر کے بھڑکایا نہ جائے) ہمیں کانفرنس کے کوی سمیلن میں ہوا۔ کوی سمیلن الہ آباد کے سنگیت ودیالیہ کے ہال میں ہوا جس میں آٹھ نو سو کا مجمع تھا۔ ہندی کے بڑے اور نامور کوی سمتر انندن پنت، نرالا، نریندر شرما، سمن وغیرہ وہاں پر موجود تھے۔ انھوں نے اپنی اپنی کویتائیں سنائیں جن میں سے بعض مقبول ہوئیں اور بعض کو لوگوں نے خاموشی اور اکتاہٹ کے اظہار کے ساتھ سنا۔ ہر مشاعرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ہندی کے ترقی پسند رفیقوں نے اصرار کیا کہ سردار جعفری بھی اپنا کلام سنائیں۔ سردار جعفری نے اس زمانے میں اپنی طویل نظم 'نئی دنیا کو سلام' نئی نئی کہی تھی۔ انھوں نے تحت اللفظ میں اس کے چند حصے سنائے۔ حاضرین نے نہ صرف اسے دلچسپی سے سنا بلکہ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس نظم سے متاثر بھی ہو رہے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد کسی زوردار بند یا خوبصورت مصرعے کے خاتمے پر زوردار تالیاں بجتیں۔ اس وقت بالکل یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مجمع اردو دانوں کا نہیں ہندی دانوں کا ہے۔ اردو مشاعروں میں شاید اس سے کسی قدر ہی زیادہ شعر فہمی کا اظہار ہوتا ہوگا۔ جب جعفری ختم کر کے بیٹھے تو جتنی تحسین و آفریں انھیں نصیب ہوئی کسی دوسرے ہندی کوی کو اس سمیلن میں اتنی نہیں ہوئی۔ کانفرنس میں ہندی اور اردو کے مسئلہ پر بحث کے دوران میں بعض اشخاص کی تنگ نظری کے

www.taemeernews.com

مظاہرے سے ہم کو کسی قدر دکھ ہوا تھا، ہندی کوی سمیلن میں اردو کے ایک نوجوان شاعر کے اس اعزاز اور عام مقبولیت سے وہ دور ہو گیا اور ہمیں اس بات کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ مستقبل ماضی پرست اور تفرقہ پرداز رجعت پرستوں کے ہاتھ نہیں۔" (۴۰۹۔۴۰۸)

'نئی دنیا کو سلام' کے بارے میں خود وہ کہتے ہیں کہ "یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار نہیں، علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم سا خاکہ ہے، جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔

وہ خود اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نظم کا سب سے اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ آنے والی نئی دنیا اور مستقبل کی علامت ہے۔ مریم اس بچے کو اپنے بطن میں پال رہی ہے جسے اس بات پر فخر ہے کہ آنے والے دور کے مستقبل کو جنم دینے والی ہے اور یہ فخر صرف ایک عورت کو حاصل ہے جس کے تحت اس میں فاتحانہ خود اعتمادی اور وقار پیدا ہوتا اور فطرت کے اس عظیم انفرادی عطیے پر وہ پھولے نہیں سماتی اور اس میں ہر شے پر قادر ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے جو سماج میں اس کے وقار کو بلند تر کرتا ہے۔

'نئی دنیا کو سلام' جاوید اور مریم (میاں بیوی) کی ایسی کہانی ہے جو نہ صرف ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں بلکہ اپنے سماجی منصب سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر جاوید کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے۔ مریم چوں کہ حاملہ ہے، اس لیے جاوید مرنے سے پہلے اپنے ہونے والے بچے کو ایک خط لکھتا ہے جس میں ایک نئے ہندوستان کی تصویر ہے۔ وہ اپنے بچے کی ولادت کے ساتھ نئے ہندوستان کی آمد کا خواب دیکھتا ہے جس کے عوام تمام مصائب سے آزاد ہوں گے۔ شاعر کا سیاسی اور سماجی شعور یہاں اس بات کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ محنت کش عوام سرمایہ داری کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اور ان کی نجات کا راستہ صرف متحد ہو کر استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف جنگ میں ہے۔ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی اس کے منظر نامے کو سامنے رکھیے تو یہ نظم ہمیں یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ یہ دنیا عالمی جنگ کے بحران سے ابھی ابھی باہر نکلی ہے۔ فضا میں سیاہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے بموں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ اس پس منظر میں نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے یہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ
سیاہ پھن میں یہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں
یہ عقاب، یہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
یہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم یہ درد کو جگائے ہوئے
ضمیر عبدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اُجالے سے منہ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنیٔ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیر حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی منظر نامے کو سامنے رکھیے اور علامتوں پر غور کیجیے۔ پھریرے کا رنگ سیاہ ہے۔ رات کی سیاہی، سیاہ زلفیں اور ان سے لپٹے ہوئے کالے ناگ۔ سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین ہل رہی ہے جو علامت ہے جبر و استبداد کی۔ یہ ہٹلر کے گھوڑے کی ٹاپیں بھی ہو سکتی ہیں اور برطانوی سامراج واد کی بھی۔ اس اندھیرے میں آسمان پر بھی سیاہی طاری ہے جہاں سیاہ عقاب چھائے ہوئے ہیں جو جاپان پر گرائے گئے بموں کا دھواں بھی ہو سکتا ہے۔ پہاڑوں پر بھی سیاہی طاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان پہاڑوں نے اپنے سینے اس طرح تان رکھے ہیں کہ کہیں بھی امان ملنی مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وادیوں، صحراؤں اور

www.taemeernews.com

دریاؤں نے بھی لوہے کی سیاہ دیوار کھڑی کر دی ہے۔ محنت کش عوام اور کھیت مزدور چوں کہ پریشان حال ہیں، اس لیے ان پر چھائی ہوئی افسردگی سے ایسا لگتا ہے کہ سارے دشت اور کھیتوں کو بھی سیاہی نے ڈس لیا ہے۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے صرف سیاہ دھواں ہی نہیں نکل رہا ہے بلکہ فیکٹریاں بھی سیاہی کا شکار ہیں۔ اسی زمانے میں محمد احمد شباب کراوری کی نظم کا ایک بند یاد آرہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ملوں کی یہ چمنیاں جو ہر دم چتا کی مانند جل رہی ہیں
یہ آدمی کو دھواں بنا کر ہوا کے اندر اگل رہی ہیں
یہ کارخانے کہ جن میں انساں کی قسمتیں آج ڈھل رہی ہیں
یہیں پہ تقدیر کے پجاری کی تیوریاں بھی بدل رہی ہیں
کہ سوئی قسمت کے ٹھیکیداروں کا اب جنازہ نکل رہا ہے
بہت بڑا انقلاب کوئی فضا کے اندر مچل رہا ہے
مزاج انساں بدل چکا ہے، دماغ انساں بدل رہا ہے

مایوسی اور تباہی کا یہ عالم ہے کہ چراغ سے نکلنے والی روشنی کی لویں بھی سیاہ پڑ گئی ہیں اور تباہی کی دیوی نے عوام کی حالت ایسی کر دی ہے کہ جیسے گھروں میں قید سیاہ کیڑے رینگ رہے ہوں۔ حسیناؤں کی جبینیں سیاہ پڑ گئی ہیں جو سیاہ دوپٹوں کے آنچل میں ڈھکی ہیں اور جن کے جسم پر سیاہ لباس ہیں جو سوگ کی علامت ہے۔

ظالموں نے اس قدر قہر برپا کیا ہے کہ ماؤں کی چھاتی کا دودھ سیاہ پڑ گیا ہے اور ان کی گود میں بچے بھی سیاہ پڑ گئے ہیں۔ تاریک فضا میں زہر میں بجھے تاریکی کے تیر دلوں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ ظالموں کے سیاہ ہاتھ معصوموں کی سیاہ گردنوں پر ہیں اور ان کے جسم پر کوڑوں کے سیاہ نشان ہیں اور ان کے بدن پر زخموں کی سیاہی بربریت کی داستان کہہ رہی ہے۔ چاروں طرف کی تاریکی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دور غلامی اور بے ضمیری کا دور ہے۔ اسی لیے اس عالم میں ہر شخص روشنی سے کترا رہا ہے اور غیرت و ندامت سے سیاہی میں اپنا منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ ایسے میں شاعر کو صبح انقلاب کی روشنی کی تلاش ہے جو انسان کے ضمیر کو غیرت اور عظمت انسانی کا نور عطا کرے۔ اسی اندھیرے سے دو شکلیں ابھرتی ہیں۔ یہ شکلیں جاوید اور مریم کی ہیں جو دولہا، دلہن کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

غور طلب ہے کہ اردو شاعری میں پہلی بار عورت کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو عظمت انسانی کے تحفظ کے لیے مرد کے شانہ بہ شانہ اس جدوجہد میں کسی قدر پست یا کمزور نہیں ہے۔ اس موقعے پر مجاز کے خوابوں کی اس انقلابی عورت کی تصویر بھی ہمارے سامنے ابھر کر آتی ہے جس کے آنچل کو انقلابی پرچم کی شکل میں دیکھنے کی تمنا ہے۔

جاوید، مریم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو مجھ سے اس قدر کیوں شرما رہی ہے۔ بھلا گل کو نسیم سحر سے حجاب کیسا؟ اس منظرنامے سے ابھرنے والی تصویر میں صرف مرد اور عورت کے عشقیہ جذبات نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے آنے والے زمانے کا خواب ہے۔ جاوید مریم کی پلکوں میں حیا اور رخ پر حسن و محبت کا جو ہالہ دیکھ رہا ہے وہ اس کے خوابوں کے ہندوستان کی تصویر ہے۔ ہندوستان کا روشن مستقبل ہی اس کی زندگی کا اُجالا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ترے رخ پر یہ حسن و محبت کا ہار
یہی ہے مری زندگی کا اُجالا
جو ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی پر گویا کنول کھل گیا ہے
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے

مریم زیر لب مسکراتی ہے تو شاعر کہتا ہے:

تری مسکراہٹ میں کیا دل کشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیوں کر بجھے گی؟
سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟

یہاں سمندر سے پیاسے کو شبنم ملنے کا خیال نہ صرف اقبال کی یاد کو تازہ کرتا ہے بلکہ وہ اپنی مریم یعنی ہندوستان کو ہر اعتبار سے خوش حال دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا صرف یہی نصب العین ہے کہ غلام ہندوستان آزاد ہو، نہ صرف انگریزوں کی بربریت سے بلکہ ہر طرح کے استحصال سے۔ اسے غلامی سے پہلے کے ہندوستان کی یاد آتی ہے اور کہتا ہے:

www.taemeernews.com

ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شرابِ محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ ہے میرے سینے میں آباد اب تک
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا
ہماری تمنا کو بیدار رکھا
جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گزرنا سکھایا

یعنی یہاں شاعر ماضی سے عہد حاضر کی طرف آتا ہے۔ غلامی کی زنجیر توڑ کر آزادی کا خواب دیکھتا ہے۔ اسی آزادی کی جدوجہد میں اپنے صبر واستقلال کا ذکر بھی کرتا ہے اور آزمائشوں سے گزرنے کا بھی۔ وہ "گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے" والے حوصلے اور اعتماد کے ساتھ مریم کو دیکھتا ہے اور مریم اسے۔ مریم کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپکتے ہیں۔ وہ کہتی ہے:

مری ساری دولت محبت کے آنسو

لیکن سرداران محبت کے آنسوؤں میں نہ خود ڈوبتے ہیں اور نہ اپنی مثالی عورت کو ڈوبنے دیتے ہیں۔ یہاں ان کا وہ مارکسی نظریہ انھیں تقویت بخشتا ہے جس کے تحت عورت سماج کی دبی کچلی شے نہیں۔ وہ مرد کے شانہ بہ شانہ انقلابی سرگرمیوں میں اس کی شریک ہی نہیں بلکہ کہیں تو مرد سے بھی برتری حاصل کرتی ہے۔ اس کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، اس لیے وہ مرد سے کئی معنوں میں افضل بھی ہے۔ وہ کہتی ہے:

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
'پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'
ابھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمع شبستاں ہے نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوش تہذیب کا گاہوارہ

یہاں سردار جعفری عورت کی وہ تصویر پیش کرتے ہیں جس کی بنیاد ہزاروں سال کی تہذیبی وراثت پر بھی ہے۔ یہاں عورت ایک دبی کچلی اور کمزور مخلوق نہیں ہے جس کا ثبوت ہر دور کی تاریخ میں نمایاں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصہ حاصل نہیں کرے گی، تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے"۔ اور یہی وہ عورت ہے جو 'نئی دنیا کو سلام' میں نئی نسل کی پرورش کرتی نظر آتی ہے جس پر اس کے شوہر کو فخر ہے۔ وہ کہتا ہے:

کونپل تھی کل، اب ہے پھولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

اور آنے والے ہندوستان کا مستقبل مریم کی کوکھ میں انگڑائیاں لے رہا ہے جس کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
ہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں

www.taemeernews.com

مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

نظم کی تیسری تصویر آزادی اور انقلاب کے خوابوں کی تصویر ہے۔ صرف سخن فہمی میں ہی نہیں بلکہ شعر گوئی میں بھی سردار جعفری اقبال سے کس قدر متاثر ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کے شعر سے آغاز کرتے ہیں:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

مریم پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک کرتا سی رہی ہے اور کپڑے کے یہ ٹکڑے کئی رنگوں کے ہیں۔ پھٹے ہوئے کپڑے کے ٹکڑوں سے ہندوستانی عوام کی حالت زار کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن مفلسی کے اس عالم میں زندگی کے مختلف رنگ ہیں جو پیوندکاری میں بھی رنگارنگی کا ثبوت ہے۔ وہ چمن جس میں بلبل کا نغمہ گونج رہا ہے، جس کے اک اک شرار میں ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں، جس کی نیلگوں فضاؤں پر بشر کے نام کا سکہ ہے، جو کہکشاں کے دوش پر سوار ہے اور ساتھ میں یہی آدمی توہمات کی سیاہی بھی ڈھو رہا ہے اور خوشی کی مے میں اپنے غموں کو ڈبو رہا ہے اور وہ زمین جو بہشت کی مانند ہے اسی زمین پر غلام قوم کی زندگی گھٹی ہوئی ہے:

مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثال شمع مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی

اگرچہ یہ جہانِ آب و گل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے

اسی عالم میں شور بلند ہوتا ہے نعروں کا اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں آتی ہیں۔ مریم کہتی ہے:

ہر طرف شور محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہورہا ہے

جاوید داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے:

دیکھ اس ننھی منی سی جان کو
جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے سہارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے
جب وہ دنیا میں آئے گا تو مامتا کی محبت
تیرے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی

جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے، زیر لب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہوگا، کہ ان ننھے
معصوم ہونٹوں میں، دنیا کے سارے خزانے سمٹ
آئے ہیں

لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستان کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسر نہیں ہے
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں
خاک سے اٹھ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے

•

اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سینکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی
ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں
میں، جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں

اسی مایوسی کے عالم میں امید کی کرن نظر آتی ہے اور جاوید کہتا ہے:

گولیاں سنسناتی ہیں اڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

اور مریم مرحبا کہتی ہے۔ جاوید عہدِ نو کا اعلان کرتا ہے جو دولتیں، برکتیں، راحتیں اور لذتیں لے کر آرہا ہے۔ انقلابیوں

www.taemeernews.com

کے نعرے فضا کو معطر کر رہے ہیں اور سب کے دلوں میں ایک نئے سویرے کا خواب مچل رہا ہے اور ملک کے سنگ اور خشت میں، سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں، کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ہندوستانی عوام مطالبہ کر رہے ہیں کہ یہ حسیں بوستاں ہمارا ہے اور ہمیں جینے کا حق یعنی آزادی چاہیے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نظم میں مریم ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو زندگی کی دوڑ میں ہر قدم پر اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔ وہ بالائے بام پر نہیں ہے اور نہ ہی چلمن سے جھانک رہی ہے۔ وہ سماجی حقائق سے آنکھیں ملا کر تمام مسائل کا مقابلہ کرتی ہے۔ برطانوی حکمرانوں کی طرف سے جاوید اور مریم پر بغاوت کا مقدمہ چلتا ہے۔ فرنگی مریم سے پوچھتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے تو وہ کہتی ہے کہ جب سے فرنگی آئے ہیں، گھر کی ساری برکتیں اٹھ گئی ہیں۔ وہ کہتی ہے:

تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا

جاوید کہتا ہے:

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر
اک نیا جال پھیلا رہے ہو
ساری دنیا کو بہکا رہے ہو۔

برطانوی حکومت کی طرف سے جاوید کو پھانسی اور مریم کو قید کی سزا سنانے پر مریم کہتی ہے:

ایسے ایوان عدل و صداقت پہ لعنت
ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

جاوید کو موت کی سزا ہونے پر مریم کو اس بات کا ملال ہے کہ اس کو بھی جاوید کی طرح اپنی جاں نثار کرنے کا موقع کیوں نہیں ملا۔ وہ تمنا کرتی ہے کہ کاش میرا لہو بھی کام آتا۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں ہے بلکہ انقلاب کی خاطر قربانی کا جذبہ ہے۔ کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی میں یقین رکھنے والا جاوید مریم کو سمجھاتا ہے۔ خدمت ملک و قوم کے طریقے صرف جان دینے کے نہیں بلکہ اور بھی ہیں۔ یعنی مریم کے سامنے آج سب سے بڑا انقلابی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی کوکھ میں پل رہے اس روشن مستقبل کو جنم دے اور اس کی پرورش کرے۔ کیوں کہ:

کل کا انداز کچھ اور ہوگا
بزم میں اک نیا راگ ہوگا
جنگ ہوگی نہ پیکار ہوگی
تو مسرت سے سرشار ہوگی

وہ مستقبل کے ہندوستان میں کارخانوں سے نغموں کے طوفان کی آمد اور غریبوں کے سوکھے زرد چہروں پر زندگی اور آسودگی کا رنگ دیکھتا ہے۔ پھانسی پر چڑھتے وقت مریم کو ہر طرف اندھیرا نظر آتا ہے لیکن جاوید اس کو ڈھارس بندھاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس اندھیرے کے پیچھے ایک نیا سویرا چھپا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مریم اہل وطن کو یہ بتائے کہ مرتے وقت اس کے چہرے پر موت کا خوف نہیں تھا۔ اور یہ منظر ہمیں بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کی یاد دلاتا ہے۔

چھٹا منظر مریم کے نوحے سے شروع ہوتا ہے جو ہندوستان پر شہید ہوئے سپاہی کو یاد کرتی ہے جس کی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ یہاں وہ اپنے عاشق جاوید کی شکل دیکھنے کی منتظر نہیں ہے بلکہ اس کے خوابوں کی تعبیر کی منتظر ہے۔ اسی انتظار اور نوحہ خوانی کے عالم میں نامہ بر آتا ہے جس کے پاس جاوید کا آخری پیغام ہے، جو اس کے بچے کے نام ہے جو ابھی تک مریم کے بطن میں ہے۔ نامہ بر کہتا ہے کہ وہ بچہ جو اس کے پہلو میں نہاں ہے وہی عہد نو کا مبارک نشان ہے، جو آنے والے ہندوستان کی نئی نسل ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کے شوہر نے مرتے مرتے اس کا نام لیا پھانسی کی رسی چوم کر آنے والی سحر کی خبر بھی دی۔ وہ پریشان نہیں تھا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کیوں کہ اس کا دل امیدوں اور امنگوں سے لبریز تھا اور روشن مستقبل پر یقین کامل رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ظلم کی رات ختم ہوگی اور نیا سویرا، نئی خوشیاں لے کر آئے گا اور تمام محنت کش اور امن پسند لوگ آزاد ہندوستان کی ہوا میں سانس لیں گے۔ اس میں تھوڑی دیر ہو سکتی ہے کیوں کہ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں اور جس کا سارا زمانہ انتظار کر رہا ہے۔ اسے اس بات

www.taemeernews.com

کا یقین ہے کہ اس کا بچہ وہ سب کچھ حاصل کرے گا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے:

جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے
اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور

سردار جعفری کا مستقبل میں یقین جاوید کی شکل میں کسی بھی قیمت پر آدمی کو ہار ماننے سے روکتا ہے اور اس کی ہمت کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ زندگی کی محرومیوں سے مایوس نہیں ہوتا اور ہر دور کے انسان کو سعیِ پیہم کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے ہماری انسانی تہذیب جن ادوار سے گزرتی ہے وہ اپنے پیچھے نہ صرف ماضی کی داستانیں چھوڑتی ہے بلکہ زندگی کے نئے رموز سے پردہ بھی اٹھاتی ہے۔ زندگی کی شمعیں روشن کرتی ہے۔ اس کے پیچھے چنگیز، نادر اور تیمور کی داستان کے ساتھ غلاموں اور کنیزوں کی لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں ہیں جو کبھی اسپارٹکس کی شکل میں تو کبھی فرہاد و منصور کی شکل میں زندگی کو روشنی بخشتی اور دنیا کو جمود سے بچاتی ہیں۔ ہزاروں سال کا بار گراں اٹھائے اس نسل انسانی کو نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد کا انتظار ہے جنھوں نے چراغ وقت کی لو سے انقلاب کے لشکر سجا رکھے ہیں اور جن کے پاؤں زمین پر ضرور ہیں لیکن ان کی نظریں آسمان کی بلندیوں پر ٹکی ہیں۔ جن کی ہتھیلیوں میں آفتاب اور مہتاب کی روشنی ہے اور اس کرۂ ارض کو تابناک بنا رہے ہیں۔ شاعر دعوت دیتا ہے:

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

ظاہر ہے کہ شاعر کا یہ خواب سردار جعفری کا اپنا خواب ہے، جو انسان اور انسانیت کو ہمیشہ کامیاب اور شادماں دیکھتے ہیں۔ فطری طور پر کبھی بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور نہ ہی مستقبل سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس بھی ہے اور جگہ جگہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اسی نظم کے پیش لفظ میں کہتے ہیں:

"میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور اس کا حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالاں کہ آج ہندوستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلا ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہو رہی ہیں جن سے دور وحشت کی درندگی بھی شرما جائے گی، لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور طاعون کی وباؤں کی طرح گزر جائے گی کیوں کہ اس کے خلاف بھی وہی قوتیں جدوجہد کر رہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔"

"دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں 'انسان' کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی۔ لیکن انسان ناقابل شکست ہے کیوں کہ اس کی محنت، عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامراں رہے گا۔ یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں ہے، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے۔ میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین 'انسان' ہے۔"

عقیدے کی یہی توانائی تھی جس نے سردار جعفری کے ذہن کو ہمیشہ تازگی بخشی اور وہ ہر نسل کے لیے چاہے وہ نئی ہو یا پرانی، کبھی اجنبی نہیں رہے۔ انھوں نے اپنی عمر کے طویل سفر میں ہمیشہ جدید خیالات اور ایجادات کا احترام کیا۔ ان کی یہی ذہنی تازگی اور کشادگی تھی کہ وہ ہر دور میں نئی نسل کے آئیڈیل رہے۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو ہے جو سردار جعفری کو کبھی مرنے نہیں دے گا۔ وہ ہمیشہ ہمارے دل و دماغ کو HAUNT کرتے رہیں گے اور دہراتے رہیں گے:

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

www.taemeernews.com

سردار کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو، الہ آباد، یونیورسٹی، الہ آباد

اردو کے ممتاز اور صفِ اول کے ترقی پسند شاعر، ادیب، ناقد اور دانشور علی سردار جعفری پہلی اگست ۲۰۰۰ء کو ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی اردو زبان، تاریخ و تہذیب کا ایک دور رخصت ہوگیا۔ ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ ساری دنیا میں ان کی موت کا غم منایا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غم ان کی ہر دل عزیز شخصیت کے اٹھ جانے کا تو ہے ہی۔ اس غم کے پیچھے، ان آنسوؤں کے پس پردہ ان کی ساٹھ پینسٹھ سالہ ادبی، ثقافتی، صحافتی اور سیاسی خدمات کا اعتراف و اظہار بھی پوشیدہ ہے۔ جو کام کر کے جاتے ہیں انھیں دنیا مختلف طریقوں سے یاد کرتی ہے، مختلف طریقوں سے خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ عقیدتوں کے بڑے روپ ہوا کرتے ہیں۔

سردار جعفری کی شخصیت اور ان کا تخلیقی و تنقیدی ادب دونوں ہی ابتدا سے جتنے مقبول رہے اتنے ہی متنازعہ فیہ۔ ان کی ہر کتاب، ہر فکر، ہر عمل غرضیکہ ہر ادا پسند بھی کی جاتی رہی اور بحث و مباحثے کے نئے نئے دروازے بھی کھولتی رہی اور ساتھ ہی ان کی شہرت و محبوبیت میں اضافے بھی کرتی رہی۔

عام طور پر یہ خیال ہے کہ سردار جعفری بنیادی طور پر شاعر تھے، لیکن جدید خیالات رکھنے والوں کا ایک حلقہ تو ایک سرے سے انھیں شاعر ہی نہیں مانتا، خود ترقی پسند حلقے میں بھی ان کی شاعری کو لے کر سرگوشیاں رہی ہیں۔ فراق گورکھپوری کہا کرتے تھے کہ سردار کی شاعری نغمگی اور لطافت سے عاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے ہر صفحہ پر خون کی ندیاں بہہ رہی ہوں، فوج مارچ کر رہی ہو۔ جذبی انھیں ایک سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر نثر نگار ہے۔

اور لوگ بھی ہیں جو سردار جعفری کو شاعر یا اچھا شاعر تسلیم کرنے میں تامل برتتے ہیں۔ جو لوگ انھیں شاعر تسلیم کرتے ہیں ان کا بھی یہ اعتراض ہے کہ سردار کی شاعری میں انیس، اقبال، جوش وغیرہ کا ایسا ملا جلا آہنگ ہے کہ ان کی اپنی انفرادی پہچان بن ہی نہیں پائی۔ ترقی پسند فکر و خیال کے بعض ناقدوں نے بھی سردار کو ایک اچھا اور بڑا شاعر تسلیم کرنے میں تکلف کیا ہے لیکن پھر بھی سردار کا شمار معدودے چند ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے اور اکثر کی زبان پر فیض کے بعد سردار کا ہی نام آتا ہے۔ ایسا کیوں؟۔

'ایک خواب اور' پر تبصرہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے یہ لکھا:

> "سردار جعفری کی شاعری جدید اردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔ جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اردو کی ترقی پسند ادبی خلاقی اپنے پورے آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔"

سجاد ظہیر نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ سردار جعفری کی شعری تخلیقات کا ابتدائی سرا اقبال اور جوش کی شاعری سے ملتا ہے جو اس زمانے کی دوسری، تیسری دہائی تک نظریاتی اعتبار سے حاوی تھے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جیسے جیسے بعد کے زمانے میں قومی اور عالمی سطح پر اشتراکی تحریکوں اور نظریات کا عروج ہوا اور ہندوستان کی قومی آزادی بھی متاثر ہوئی تو پھر مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانشوروں نے اس تحریک کو بائیں طرف موڑ دیا۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں کام سردار جعفری اور ان کی شاعری نے کیا۔

سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری کو انھیں دو سِروں

www.taemeernews.com

کے درمیان رکھ کر دیکھا جائے تو بھی سردار اور ان کی شاعری کی قدرے معرفت حاصل ہو جائے گی اور اس سردار کا عرفان حاصل ہو جائے گا جو انتہائی کچی عمر میں، عین شیعی ماحول میں منبر پر بیٹھ کر مرثیے پڑھنے والا صرف کورانہ عقیدت کے بجائے حضرت امام حسین کے غیر معمولی کردار سے ظلم کے خلاف بغاوت کا سبق سیکھ کر پورے زمیندارانہ نظام سے منہ موڑ کر لکھنؤ آتا ہے اور یہاں بھی انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اور وہ ساری اذیتیں برداشت کرتا ہے جو اس وقت کے دیوانے باغیوں کا مقدر بنی ہوئی تھیں۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کے وژن، فکر و نظر میں تبدیلی آتی ہے۔ دنیا کے انقلابات سے ان کا ذہن مرتعش ہوا ٹھتا ہے۔ اشتراکیت ایک مضبوط راہ دکھاتی ہے۔ انقلاب روس اور دنیا کے ادیبوں کے انقلابی اقدامات پابلو نرودا، ناظم حکمت، جواہر لعل نہرو، قاضی نذرالاسلام اور پھر وطن کی نامکمل آزادی، خواب در خواب ایک نئی جنگ کی تیاری۔ دنیا کی تاریخ، تہذیب، تصوف، انسان دوستی ہی نہیں انسانی جمالیات غرض کہ فکر و خیال کی دنیا میں کروٹیں ہی کروٹیں، نئی نئی شمعیں روشن ہوتی گئیں۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا کہ حافظ، سعدی، رومی، پابلو نرودا، ناظم حکمت، کبیر، گرونانک، میرا، میر، غالب، اقبال وغیرہ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ یعنی جو مذہب و مسلک رومی کا وہی سردار جعفری کا۔ جو جعفری کا وہی حافظ، سعدی کا۔ صوفی ازم اور مارکسزم کو شیر و شکر کر دیا۔ دنیا کے انسانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا اور شاعری ایک نئے درد، لے اور تیور کے ساتھ نمودار ہوئی۔ عالمی فکر اور دردمندی کے بین الاقوامی تصور سے مالا مال، ایک نئے شعری آہنگ اور فکری کردار کو پیش کرنے میں جعفری پیش پیش تو رہے لیکن یہاں بھی ان پر اعتراض و اختلاف کے تیر چلائے گئے۔ زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ترقی پسندی کے ہی مخالف تھے۔ دوسری قسم ایسے لوگوں کی تھی جو دردمندی تو رکھتے تھے لیکن اردو شاعری کو دردِ دل اور دردِ جگر سے الگ کر کے دیکھنے کے عادی نہیں تھے اور آگے چل کر ان لوگوں نے بھی سردار کی شاعری کو لائق اعتنا نہیں سمجھا جو شاعری کو صرف باطنی کیفیات کا مبہم اور پیچیدہ اظہار مانتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو سردار جعفری کی انقلابی یا خطیبانہ شاعری کس طرح پسند آسکتی ہے۔ چنانچہ اعتراضات ہوئے پوری ترقی پسند شاعری پر بالعموم اور سردار جعفری پر بالخصوص۔ ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو مزاحمتی یا ایجی ٹیشنل شاعری کا مفہوم تک نہیں سمجھتے جو ادب اور زندگی کے رشتوں پر یقین نہیں رکھتے یا پھر ان لوگوں نے جو بقول سردار جعفری "میری شاعری کو سلیقے اور سنجیدگی سے پڑھا ہی نہیں تھا۔"

صحیح بات یہ ہے کہ سردار جعفری کی بڑی شاعری وہیں جنم لیتی ہے جہاں وہ جوشِ خطابت، انقلابی آہنگ میں ڈوب جاتے ہیں اور یہ لہجہ ان کے فکر و فلسفہ کا اصل روپ اختیار کر لیتا ہے جس کے بطن سے انسان دوستی کی اعلیٰ و ارفع قدریں پھوٹنے لگتی ہیں۔ عالمیت سے پُر ایک مخصوص قسم کی بڑی شاعری کے یہی عناصر ہوا کرتے ہیں۔ کم از کم ترقی پسند شاعری، انقلابی شاعری کے بنیادی عناصر اور سردار کی شاعری کی اولین شناخت کا حوالہ تو یہی عناصر ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا خطیبانہ شاعری یا انقلابی شاعری بڑی نہیں ہوتی؟ آخر بڑی شاعری کے اصول اور پیمانے کیا ہیں۔ کیا دھیمے لہجے کی رومانی، نفسیاتی، پیچیدہ شاعری ہی بڑی ہو سکتی ہے۔ اگر صرف یہی سچ ہے کہ دنیا کی وہ تمام بڑی شاعری جو خطابت سے وابستہ ہے خواہ وہ مولانا روم کی مثنوی ہو یا اقبال کی نظم نگاری۔ آپ اسے کس خانے میں رکھیں گے۔ چونکہ یہ سطریں فی الوقت تاثراتی انداز میں لکھی جا رہی ہیں اس لیے بات کو سیدھے طور پر اس طرح سمجھ لیا جائے کہ زندگی کی طرح شاعری کے معاملات بھی بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ بڑے سرد و گرم، بڑے پیچ و خم، بڑے خشک و تر، کینوس پر ایک اچھی تصویر صرف دھیمے اور ٹھنڈے رنگوں کا مطالبہ نہیں کرتی اسے اکثر شوخ اور روشن رنگوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے جہاں جیسی ضرورت ہو۔ سجاد ظہیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ میکسکو کے عوام کی انقلابی جدوجہد کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ وہاں کے آرٹسٹوں نے عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بڑی اور عوام کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ بے حد زوردار اور پرجوش تصویریں بنانے کا فن اختراع کیا اور اب اسے عالم گیر مقبولیت حاصل ہے

www.taemeernews.com

کم و بیش اسی طرح ہندوستان کے آرٹسٹوں نے ایودھیا کے حادثے کے بعد کیا۔

سردار جعفری نے جس غلام عہد میں آنکھیں کھولیں، انقلاب کو بے حد قریب سے دیکھا۔ آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ ساتھ زنجیروں اور قید خانوں کو معشوق کی طرح گلے لگایا، وہ جس رومانی باغیانہ سرشت کے حامل تھے ایسے میں ان سے اسی طرح کی شاعری کی امید کی جاسکتی تھی اور انھوں نے اس میدان میں خوب خوب جوہر دکھائے اور طرح طرح کے تجربے کیے۔ ان کی شاعری کو سمجھنا ہے تو ان تمام تناظرات کے ساتھ ساتھ ادب کے اعلیٰ و ارفع اقدار اور نصب العین کو سمجھنا ناگزیر ہے جہاں ایسا ممکن نہیں وہاں سردار کی تفہیم بھی ممکن نہیں۔

حالی کی طرح سردار جعفری نے ابتدائی اسٹیج پر ترقی پسند ادب جیسی معیاری کتاب لکھی اور ترقی پسند فکر و نظر کی دنیا میں ہلچل پیدا کردی۔ مدتوں دنیائے ادب میں اتفاق و اختلاف کے بادل منڈراتے رہے پھر اس کے سلسلے 'پیغمبرانِ سخن' سے لے کر 'اقبال شناسی' تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سیاست، صحافت، ثقافت سب پر تجربے کیے اور کامیاب و کامران ہوئے۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر، بلا کے مفکر و دانشور غرضیکہ بقول یوسف ناظم "ان کی زنبیل میں ہر قسم کے نسخے ہیں اور ہر نسخے پر زعفران سے 'ہوالشافی' لکھا ہوا ہے۔"

ہر عظیم شخصیت، فنکار بہر حال تنازعہ کو بھی چھوتی ہے۔ بحث و تکرار، پسند و ناپسند کا مرکز بنتی ہے۔ سردار جعفری کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ ان کی علمیت، مقبولیت اور محبوبیت تھی۔ ان کا علم و فضل، ان کا منطقی و استدلالی انداز، خطابت کا بہتا ہوا اسلوب۔ الفاظ کے ابلتے ہوئے چشمے کہ بڑے بڑے تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے، بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ سب یونہی تو نہیں ہوتا اس کے پس پردہ نہ جانے کتنی دہائیوں کی ریاضت، غور و فکر کے لامتناہی سلسلے، مطالعہ و مشاہدہ کی لامحدود وسعت اور ان سب کو اپنی ذات میں تحلیل و تزئین کا کربناک تخلیقی عمل، جلنے پگھلنے کا ایک طویل سلسلہ اور پھر اس کو ایک ترتیب و تنظیم، ایک نظریہ عطا کرنا اور پھر اس نظریہ کو تاریخ، تہذیب میں جذب و پیوست کر دینا۔ ظاہر ہے کہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے تاریخ انسانیت کے بوسیدہ اوراق سے لے کر نت نئے علوم و افکار سے باخبر و باعمل ہونا پڑتا ہے اور بلاشک و شبہ سردار جعفری اپنی عمر و فکر کی ہر منزل پر، ہر موڑ پر باخبر، باعمل اور بااثر رہے اور اپنے علم و فلسفہ، شعور و ہنر اور انسان دوستی کے ذریعہ نئی نئی شمعیں روشن کرتے رہے۔ کبھی تخلیق و تنقید کے ذریعہ، کبھی تحریر و تقریر کے ذریعہ، کبھی انفرادی طور پر، کبھی اجتماعی طور پر، کبھی ڈھال بنے، کبھی تلوار، کبھی مفاہمت کبھی تکرار۔ غرض کہ ہر دور میں وہ علم و فضل، فکر و عقل کے ذریعہ اپنے گروپ میں اپنے عہد میں کلیدی و قائدانہ رول ادا کرتے رہے ایسے سردار جعفری کو جس نے اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک میں بنیادی و کلیدی رول ادا کیا ہو، جس نے شاعری کے کم و بیش دس مجموعے دیے ہوں۔ جس نے نثری تخلیقات میں بے پناہ توجہ اور شہد کا رس گھول دیا ہو، جس کی تقریروں نے ہنگامے برپا کر رکھے ہوں، جس نے اپنے خطبوں، اداریوں، بحثوں، انشائیوں، فلموں وغیرہ کے انبار لگا رکھے ہوں، جس نے انسان کی عظمت سے لے کر انسانی ذہن کی تمام بوالعجبی و بوقلمونی پر دسترس حاصل کر رکھی ہو۔ جمالیات، نفسیات، فلسفہ، تصوف، بھگتی، مارکسزم، کمیونزم، سوشلزم، کانگریس، میڈیا، صحافت وغیرہ پر اپنی مہریں ثبت کر رکھی ہوں۔ اس سردار جعفری کو سمجھ پانا، اور بھلا پانا ناممکن ہے۔

تخلیق و تنقید، تقریر و تصویر، جلال و جمال، شعلہ و شبنم غرض یہ کہ ہر طرح کے جذبات سے معمور سردار جعفری کی شخصیت اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔ ایک داستان اور ایک دبستان۔ ایسی تاریخی شخصیت جس کا غم منایا جانا ایک فرد کا نہیں بلکہ اسی سالہ تاریخ و تہذیب سیکولرزم اور سوشلزم کا غم منایا جانا ہے۔

علی سردار جعفری آج جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان کے عظیم کارنامے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

□□□

www.taemeernews.com

حرکت و انقلاب کا استعارہ

علی سردار جعفری

ڈاکٹر ہمایوں اشرف
صدر شعبۂ اردو، بوکارو اسٹیل سٹی کالج، بوکارو

ابھی ہم مجروح سلطانپوری کی موت کے غم سے جانبر بھی نہیں ہوئے تھے کہ بادِ اجل نے ایک اور چراغ گل کر دیا۔ اردو کے عالمی شہرت یافتہ شاعر، ذی فہم ادیب، صاحب نظر نقاد، محقق اور دانشور علی سردار جعفری بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۱۳ء کو بلرام پور کے افق پر طلوع ہونے والا یہ سیارہ یکم اگست ۲۰۰۰ء کو ممبئی کے جوہو قبرستان کی خاک اوڑھ کر سو گیا۔ جعفری صاحب گزشتہ دو ماہ سے بامبے اسپتال میں برین ٹیومر سے جوجھ رہے تھے۔ لیکن بھلا موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ان کے انتقال کی خبر سے ملک کے ادبی، لسانی اور ثقافتی حلقے میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ علی سردار جعفری کی رحلت اردو دنیا کے لیے یقیناً ایک عظیم سانحہ ہے۔ ان کی موت سے اردو ادب ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی ادب کا جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس وقت ہندوستان کے ادبی منظر نامے پر ان جیسا انقلابی شاعر، شعلہ بیان مقرر، بے باک صحافی، دانشور اور مشترکہ تہذیب کا علمبردار ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۷ سال تھی، جس میں سے ستر سال سے زیادہ حصہ اردو شعر و ادب کی خدمت اور سامراجیت، ظلم و جبر اور طبقاتی تفریق کے خلاف جہاد میں گزرا۔ انھوں نے خدمتِ لوح و قلم کے ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا۔ تحریک آزادی کی لڑائی کے ساتھ ساتھ کسانوں، مزدوروں، دلتوں، پسماندوں کی بیداری اور ان کی سرگرمیوں میں بھی شریک رہے اور حکومت برطانیہ کے خلاف مختلف قسم کی بغاوتوں کے الزام میں جیل بھی گئے۔ حق مغفرت کرے۔ عجب آزاد مرد تھا۔

جعفری صاحب آخری لمحے تک ادبی و ثقافتی اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ وہ زندگی بھر قلم کے سپاہی بنے رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی۔ ساری زندگی اپنے قلم کو انسانی زندگی کی بہتری کے لیے ایک طاقت ور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے پسماندہ اور دبے کچلے لوگوں کو اپنی تخلیقات سے جگایا اور ہمیشہ زندگی کی کھردری سچائیوں کو لفظوں کے ذریعہ بیان کیا۔ سردار جعفری کھوکھلی روحانیت، ماضی پرستی، فراریت، فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کے کٹر مخالف تھے اور اپنے آپ کو مذہب و قومیت، فرسودہ سماج اور ملکی دائرے میں قید کر کے نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ آزادی، مساوات، حق و انصاف، اجتماعیت، جمہوریت، سماجی حقیقت نگاری، انسان دوستی، رجائیت، معروضیت، آزادیٔ فکر و اظہار اور انقلابی اقدار پر زور دیا۔ وہ انسانیت کے شیدائی اور علمبردار تھے۔ ان کا دل سوز محبت سے لبریز تھا۔ تمام انسانوں کے دل کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں ہر ایک کے غم میں اشک بار ہوتیں اور سب کی خوشیوں پر مسکراتی تھیں۔ غریبوں، دکھیوں اور غمزدوں کے لیے رحم کے جذبات سے چھلک جاتی تھیں۔ جعفری صاحب وابستگی کے فنکار تھے۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں اور قافلہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اور دانشوری ایک امر مسلمہ ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ (۱۹۹۲ء میں 'علی سردار جعفری: حیات اور کارنامے' عنوان کے تحت لکھے گئے وقیع تحقیقی مقالہ پر رانچی یونیورسٹی نے راقم الحروف کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند سے نوازا) اردو شاعری کے

www.taemeernews.com

ترقی پسند اور انقلابی کردار کو ایک نئی جہت سے آشنا کرنے والوں میں علی سردار جعفری کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔

جعفری صاحب، فیض احمد فیض کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کی تخلیقی شخصیت متنوع جہات کی حامل ہے۔ اردو ادب اور اردو رجحانات کا ایک پورا دور ان کی شخصیت اور کارناموں سے وابستہ ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک میدان تک محدود نہیں کیا۔ صحافت و ادب، افسانہ و ڈراما، تنقید و تحقیق، خطابت و شاعری، سیاست و اشتراکیت، فلم و ٹی وی، ریڈیو و اسٹیج، مکالمے و غنائیے، ہر میدان میں انھوں نے اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھائیں۔ انھوں نے جس صنف ادب پر قلم اٹھایا، اسی میں تخلیق کی جوت سے اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا۔ شاعری کی جملہ اصناف پر طبع آزمائی کے ساتھ نثر میں بھی ان کے قلم نے افسانے، ڈرامے، خودنوشت سوانح، رپورتاژ، تنقیدی و تحقیقی مضامین، تبصرے، اداریے سے لے کر کالم تک ہر نوع کے موضوعات پر اہم ترین تحریریں پیش کیں۔ ایسی تحریریں جن میں اپنے عصر کا آئینہ بننے کی صلاحیت بھی تھی۔ اسی لیے ان کا شمار بین الاقوامی شہرت کے حامل تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ یوروپ اور ہندوستان کی متعدد زبانوں، انگریزی، فرانسیسی، روسی، ازبک، چینی، فارسی، ہندی، تیلگو، ملیالم وغیرہ میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

سردار جعفری اتر پردیش کے بلرام پور قصبہ (ضلع گونڈہ) کے ایک زمیندار گھرانے میں ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن وہیں گزرا اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے۔ علی گڑھ میں انھوں نے اچھی خاصی شاعری شروع کر دی تھی اور ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں۔ اس زمانے میں اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور، عصمت چغتائی اور معین احسن جذبی بھی وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں تھے۔ یہ تمام لوگ جدید اردو ادب کے نہایت اہم اور ہوش مند معمار اور اشتراکی و سوشلسٹ تھے۔ جعفری صاحب بھی ان کے رنگ میں رنگ گئے اور باقاعدہ ان کے مجالس میں شریک ہو کر پُرجوش تقریریں کرنے لگے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں انھیں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمی کے جرم میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ وہاں سے نکالے جانے کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور عربک کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی ان کی سیاسی سرگرمی اور تقریربازی کا شوق جاری رہا۔ دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ گئے اور لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ وہاں قبل سے ہی سبط حسن، مجاز، علی جواد زیدی، انور جمال قدوائی، حیات اللہ انصاری اور ریشپال جیسے دوست و احباب، ہم نوالہ و ہم پیالہ موجود تھے۔ جعفری صاحب نے لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی طلبا کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور معتوب ہوئے۔ وہ یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کے باقاعدہ سکریٹری بنا دیے گئے تھے، لہٰذا احتجاج اور تنظیم کی تمام تر ذمہ داریاں ان پر ہی تھیں۔ سردار جعفری نے اسی زمانے میں مجاز، اور سبط حسن کے اشتراک سے رسالہ 'نیا ادب' اور ہفتہ وار اخبار 'پرچم' نکالنا شروع کیا تھا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد شباب پر تھی۔ جعفری صاحب کو اپنی شاعری میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے کے جرم میں یونیورسٹی کے فائنل امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور دسمبر ۱۹۴۰ء میں انھیں گرفتار کر کے لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ بعدازاں ان کو بنارس جیل منتقل کیا گیا۔ تقریباً آٹھ ماہ بعد رہائی ملی۔ ۱۹۴۱ء میں پھر گرفتاری عمل میں آئی۔ ۱۹۴۲ء میں جب کوشش پیہم کے بعد بھی ایم۔ اے کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی تو انھیں اپنے مستقبل کا خیال ستانے لگا۔ کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی کے مشورے پر ممبئی چلے گئے اور پارٹی کے اخبار 'قومی جنگ' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ جب کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی قرار پائی تو جعفری صاحب ایک بار پھر گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں آرتھر روڈ جیل اور ناسک جیل میں رکھا گیا تھا۔

علی سردار جعفری، طالب علمی کے دوران ہی سامراجیت

www.taemeernews.com

اور فسطائیت کے خلاف لڑائی میں عملی طور پر شریک ہونے اور تادم حیات انسانی معاشرے کی آزادی اور انسان کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے تحریکِ آزادی میں بڑی دلیری کے ساتھ حصہ لیا تھا اور ملک کی آزادی کے لیے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ مجھے ان کو قریب سے جاننے کا بارہا موقع ملا۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ وہ آخری دم تک ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے۔ انھوں نے اس تحریک اور ترقی پسند ادب کے پودے کو اپنے جگر کا سارا لہو پلا کر ملک کی پتھریلی زمین پر سینچا تھا، جو اب لہلہا رہا ہے اور اس میں مختلف رنگوں کے حسین پھول کھل رہے ہیں۔

جعفری صاحب ممبئی سے ترقی پسند ادب کا ترجمان رسالہ 'گفتگو' نکالتے تھے۔ جسے ادبی حلقے میں پسند کیا جاتا تھا۔ 'گفتگو' کے 'ترقی پسند ادب نمبر' کو ایک دستاویز قرار دیا جاتا ہے۔ سردار جعفری فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے متعدد فلموں مثلاً 'انہونی'، 'زلزلہ'، 'فٹ پاتھ'، 'پردیسی'، 'شہر اور سپنا'، 'دھوبی ڈاکٹر' وغیرہ کے گیت اور فلم 'میلہ'، 'سازش' اور 'حبہ خاتون' کی کہانیاں لکھی تھیں۔ اس کے علاوہ 'پھر بولوا ے سنت کبیر'، 'ڈاکٹر محمد اقبال'، 'ہندوستان ہمارا'، 'جدوجہد آزادی کے سو سال' (انگریزی میں)، 'لال قلعہ'، 'سابرمتی آشرم'، 'شالیمار باغ'، 'کہانی اور ڈائرکشن' (تین حصوں میں) جیسی ڈکیومینٹری فلمیں بھی بنائیں۔ انھوں نے ایک ٹی وی سیریل 'کہکشاں' بھی بنایا تھا جو حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، فیض، مخدوم اور مجاز وغیرہ کے ادبی اور ذاتی زندگی پر مبنی تھی۔ یہ سیریل بہت مقبول ہوا تھا۔

سردار جعفری نے بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں کہانیاں بھی لکھیں اور ڈرامے بھی۔ بعد کو وہ ان سے دست کش ہو گئے اور جلد ہی ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنی صحیح پہچان بنائی۔ لیکن ان کے افسانوں و ڈراموں، تنقیدی و صحافتی مضامین کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جعفری صاحب نصف صدی تک اردو ادب پر چھائے رہے۔

علی سردار جعفری برصغیر کے ممتاز اور اہم ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک کے اس ہراول دستے سے تھا، جس نے تحریک کو ملک کے طول و عرض پر پھیلانے میں عملی جدوجہد کی تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز تحریک کی ابتدا سے قبل ہی ہو چکا تھا لیکن عوامی مقبولیت انھیں تحریک میں شمولیت کے بعد ملی۔ بنیادی طور پر ان کا طبعی میلان نظم کی طرف تھا لیکن انھوں نے غزل کو بھی لائقِ اعتنا سمجھا۔ سردار جعفری کی شاعری ترقی پسند افکار اور عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ موضوع، ہیئت اور اسلوب ہر پہلو سے، ان کی شاعری کا مقصد و محور عوام ہیں۔ اپنی شاعری کے ذریعہ وہ عوام میں تاریخی شعور پیدا کرنے اور ان کے ذہن کو انقلاب کے لیے تیار کرنے کے متمنی تھے۔ جعفری صاحب کی شاعری میں عوامی فکر و فلسفہ، انسان دوستی، جمہوری اقدار، انقلاب کی لے، جوش و ولولہ، للکار، سرشاری کے ساتھ ساتھ شعری حسیت اور جمالیاتی احساس بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی و سماجی حقیقتوں کی کھردرا ہٹ کے ساتھ ساتھ مترنم ڈکشن کا جمال بھی موجود ہے۔

سردار جعفری کی نظم نگاری کے دو تیور ہیں۔ ایک PROSAIC یعنی نثری اور دوسرا اس کے بالکل برعکس انتہائی شاعرانہ، دلکش اور والہانہ ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جب وہ محسوس کرتے تھے کہ انھیں صرف پیغام دینا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں تو وہ اپنے منصب سے نیچے اتر جاتے تھے۔ شاید یہ ترقی پسندی کی وہ دین ہے جس میں اس بات پر کبھی زور دیا گیا تھا کہ شاعری پروپیگنڈے کا بھی نام ہے، ایک آلہ ہے، ایک ہتھیار ہے لیکن جب انھیں اس امر کا احساس ہو جاتا ہے کہ ان تمام چیزوں پر فضیلت رکھنے والی چیز POETIC SENSIBILITY اور اس کا اظہار ہے تو وہ اردو کے اہم ترین نظم نگاروں کے شانہ بہ شانہ ہی نہیں بلکہ کہیں کہیں آگے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، خواہ وہ فیض ہی کیوں نہ ہوں۔ دونوں قبیل کی مثالیں دیکھیے:

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے، تہذیب تاتاری سے

www.taemeernews.com

بغاوت جبر و استبداد سے ، سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے ، لکشمی سے ، بھیم و ارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے
بغاوت وہم کی پابندیوں سے ، قید ملت سے
بغاوت آدمی کو پیسنے والی مشینت سے
بغاوت حرمت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصر حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے
(نظم 'بغاوت')

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
(نظم 'ہاتھوں کا ترانہ')

میری وادی میں وہ ایک دن یوں ہی آنکلی تھی
حسن اور نور کا بہتا ہوا دھارا بن کر
محفلِ شوق میں ایک دھوم مچادی اس نے
خلوتِ دل میں رہی انجمن آرا بن کر
شعلۂ عشق سر عرش کو جب چھونے لگا
اڑ گئی وہ مرے سینے سے شرارہ بن کر
اور اب میرے تصور کا افق روشن ہے
وہ چمکتی ہے جہاں غم کا ستارہ بن کر
(نظم 'غم کا ستارہ')

سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ، ترا شاعر آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گزشتہ کی کتاب
بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھولی ہوئی آنکھوں کے حباب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب
(نظم 'ایک خواب اور')

بالیاں دھان کی ، گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازار میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سوجاتی ہے
(نظم 'فریب')

ان کی مختصر ترین نظموں میں بھی ایک خاص قسم کی شگفتگی، رعنائی اور POETIC SENSIBILITY کا احساس ہوتا ہے۔ بطور مثال 'تیرے پیار کے نام'، 'جب تیرا نام لیا'، 'درد ایک چاند'، 'غم کا ہیرا'، 'اجنبی آنکھیں'، 'فصیلِ شب'، 'پیاس بھی ایک سمندر'، 'یاقوت لبی'، 'نسیم تری قبا' نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ صرف دو نظم ملاحظہ فرمائیں:

کون دے سکتا ہے یاقوت لبی کی قیمت
کون کر سکتا ہے قرض نگہ یار ادا
دونوں عالم میں ترے ایک تبسم کا خراج
(نظم 'یاقوت لبی')

نسیم تری قبا ، بوئے گل ہے پیرہن
حیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیل سحر ، جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتے ہیں
(نظم 'نسیم تری قبا')

سردار جعفری کے اصل شعری جوہر غیر پابند نظموں میں کھلتے ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم کو بھی عوامی جدوجہد کے لیے استعمال کیا ہے۔ جعفری نے آزاد نظم کو خالص داخلی اور مبہم جنسی موضوعات کے جال سے باہر نکال کر عوامی مسائل کے

www.taemeernews.com

لیے برتا۔ اس سے طبقاتی کشمکش کو ابھارنے میں مدد ملی۔ عوام کی اقتصادی اور سیاسی زندگی کی تصویر کشی، کسان اور جاگیردار، غلام اور آقا، مزدور اور سرمایہ دار، سامراج اور محکوم ملکوں کا تضاد، جدوجہد، امن اور ترقی کی آرزو، انقلاب کا پیغام، سائنٹفک سیاسی نظریے کی ترسیل ان کی آزاد نظموں کے عام موضوعات ہیں۔ 'فریب'، 'کون دشمن ہے'، 'پتھر کی دیوار'، 'امن کا ستارہ'، 'خون کی لکیر'، 'ایشیا جاگ اٹھا'، 'نئی دنیا کو سلام'، 'اودھ کی خاکِ حسیں'، 'تجدید وفا'، 'ٹوٹا ہوا ستارہ'، 'انتظار نہ کر'، 'سیہ لہو'، 'پیاس کی آگ'، 'پیراہنِ شرر'، 'میرے عزیزو'، 'میرے رفیقو'، اور 'ایک خواب اور' نہ صرف ان کی عمدہ اور کامیاب نظمیں ہیں بلکہ یہ اردو ادب کی وہ شاہکار ہیں جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جعفری صاحب کی غزلوں میں بھی زندگی کی سچائیوں کا دو ٹوک اظہار ہوا ہے۔ انھوں نے محبت کو ارضی روپ میں پیش کیا، خوابوں کے طلسم کو توڑا، زندگی کے غیر حقیقی رشتوں سے اجتناب کیا اور بھوک، افلاس، مساوات، مظلوم و جابر حکمراں طبقے کے خلاف بغاوت، غلامی کا کرب، آزادی کی خواہش، امن کا خواب جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں میں برتا۔ سردار جعفری نے اپنی غزلوں سے بھی وہی کام لیا ہے جو وہ نظموں سے لیتے رہے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک PROTEST کا احساس ہوتا ہے اور یہ PROTEST کلاسیکی لفظیات کو نئے معنی میں پرونے سے پیدا ہوا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

تمام دولتِ کونین ہے خراج اس کا
یہ دل نہیں کسی ٹوٹے ہوئے نگر کی طرح

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم

اسی دنیا میں دکھا دیں تمھیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی کبھی کوئے بتاں میں آؤ

صحنِ زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا ہجوم
شمع کی طرح فروزاں سرِ دیوار آنکھیں

راہ میں فوجوں کے پہرے، سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکتِ شاہانہ ہم

جراحتوں کی سیاست ہے جن کا فن سردار
اب ان سے کہیے تو کیا حاجت رفو کہیے

سردار جعفری کی شاعری آفاقیت، ہمہ گیری اور دائمی قدروں کی حامل ہے۔ انھوں نے کلاسیکی نظم و ضبط اور شائستگی کے ساتھ جدید اظہار خیال و اسالیب بیان کو بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔ ان کے اسلوب میں ندرت اور تازگی کے ساتھ ساتھ چند کلاسیکی روایات کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔

علی سردار جعفری بے پناہ شعری قوت کے مالک تھے۔ ان کا جو POTENTIAL ہے وہ بہترین شاعر کا POTENTIAL ہے جسے انھوں نے زیادہ تر EXPLOIT کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ان کے فن پر ان کا پیغام حاوی ہو جاتا ہے اور ان کی تمام تر POETIC SENSIBILITY کراہنے لگتی ہے۔ جہاں بھی انھوں نے شعری مطالبات کا خیال رکھا ہے وہاں وہ تمام ترقی پسند شاعروں میں سب سے بلند و برتر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے 'پرواز' (۱۹۴۳ء)، 'نئی دنیا کو سلام' (۱۹۴۸ء)، 'خون کی لکیر' (۱۹۴۹ء)، 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۱ء)، 'امن کا ستارہ'، 'پتھر کی دیوار' (۱۹۵۳ء)، 'ایک خواب اور' (۱۹۵۴ء)، 'پیراہن شرر' (۱۹۶۵ء)، 'لہو پکارتا ہے' (۱۹۷۸ء) اور 'نومبر میرا گہوارہ' (منظوم سوانح) کے مطالعے سے مذکورہ نکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

جعفری صاحب ایک نقاد کی حیثیت سے بھی معروف تھے۔ ان میں مقابلے و موازنے کی قوت شدید اور نکتہ فہمی کی صلاحیت بے پناہ تھی۔ ایک ناقد کی حیثیت سے انھوں نے تنقید کی کوئی بوطیقا مرتب کی اور نہ ہی تنقید کے اصول اور ضابطوں کو احاطۂ تحریر میں لاکر تنقید کی ماہیئت اور منصب سے بحث کی ہے۔ ان کی تنقید میں وہی اصول و ضابطے ملتے ہیں جو ترقی پسند تحریک یا مارکسی تنقید سے عبارت ہے۔ ان کی سب سے مشہور تنقیدی تصنیف 'ترقی پسند ادب' ہے، جسے ترقی پسندی کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں اور تجزیہ بھی۔ کٹر ترقی پسند نقاد ہونے کے باوجود جعفری صاحب کو جمالیات سے عار نہیں تھا۔ انسان اور انسان دوستی کا سبق ان کے تنقیدی رویے میں بھی ملتا ہے۔ 'اقبال شناسی' اور

www.taemeernews.com

'پیغمبرانِ سخن' انھیں ایک اعلیٰ تنقیدی منصب پر لا کھڑا کرتی ہے۔ صرف یہ دونوں کتاب ہی انھیں اردو نقادوں کی پہلی صف میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں ان کا قلم خاصا منجھا ہوا اور چوکس معلوم ہوتا ہے۔ سردار جعفری میں ایک بڑا نقاد چھپا ہوا تھا۔ ان کی قوتِ تنقید کا اندازہ صرف 'ترقی پسند ادب' کی بنیاد پر نہیں لگایا جاسکتا ہے بلکہ اس امر کا اندازہ ان کے لکھے ہوئے دیباچوں، مقدموں، تبصروں، تنقیدی مضامین اور اداریے کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ میر، غالب، کبیر داس، میرا، اقبال اور دیگر شعرا پر تحریر کردہ مضامین سے بھی ان کی قوتِ استدلال، منطقی توضیحات، استدلالی تجزیے اور جمالیاتی احساسات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

سردار جعفری نے افسانے اور ڈرامے لکھے، رپوتاژ بھی۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'منزل' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ ڈراموں کے مجموعے 'یہ کس کا خون؟' اور 'پیکار' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ 'لکھنؤ کی پانچ راتیں'، 'ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'، 'غالب اور اس کی شاعری' (انگریزی میں بہ اشتراک قرۃ العین حیدر)، 'کبیر بانی'، 'میرا بانی'، 'سرمایۂ سخن'، وغیرہ ان کی اہم مطبوعات ہیں۔ جعفری صاحب نے میر، غالب، اقبال، کبیر اور میرا بائی میں نہ صرف گہری دلچسپی لی بلکہ ان کے کلام کو ہندی اور اردو زبان میں ترجمہ کر کے پیش بھی کیا۔ انھوں نے ہندی رسم الخط میں 'دیوانِ میر' اور 'دیوانِ غالب' کی تدوین کی اور ڈاکٹر راج نگم کے اشتراک سے دیوناگری رسم الخط میں اردو غزلوں کا انتخاب 'غزل نامہ' (سات جلدوں میں) پیش کیا، جسے ہندی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے کبیر داس اور میرا بائی کے کلام کو اردو میں منتقل کیا اور اپنے وقیع مقدمہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا۔ حال ہی میں انھوں نے غالب کی طویل فارسی مثنوی 'چراغِ دیر' کا منثور ترجمہ کیا تھا، جو معروف افسانہ نگار و شاعر اور بہار قانون ساز کونسل کے چیئرمین پروفیسر جابر حسین کی کاوش سے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے۔

علی سردار جعفری کو ان کے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں قومی و بین الاقوامی سطح کے متعدد انعامات و اعزازات ملے۔ ۱۹۹۸ء میں انھیں ملک کا باوقار اعزاز 'گیان پیٹھ ایوارڈ' ملا۔

مگر یہ تمام انعامات و اعزازات اس محبت اور عقیدت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، جو انھیں ان کے پڑھنے والوں نے عطا کی تھی۔ سردار جعفری کبھی کسی ایوارڈ و اعزاز کے محتاج نہیں رہے۔ عصری ادب میں ان کی حیثیت ایک سردار کی سی تھی۔ ان کی کمی کا احساس تادیر رہے گا۔ اردو شعر و ادب کے ایوان میں ان کی آواز مدتوں گونجتی رہی اور آئندہ بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔□□□

اردو اکادمی دہلی کے ایک پروگرام میں بائیں سے: جناب اشتیاق عابدی، جناب علی سردار جعفری، جناب غلام نبی آزاد، جناب خداداد خاں مونس اور جناب زبیر رضوی

www.taemeernews.com

سردار جعفری کی نظمیں ــــ تہذیبی سروکار

کوثر مظہری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 110025

یوں تو بظاہر سردار جعفری کی زیادہ تر نظمیں ہنگامی نوعیت کی ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تہذیبی و ثقافتی ویژن بیدار ہے۔ بلکہ اس عہد میں جب ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا، دو تین شعرا ایسے نظر آتے ہیں جن کی جڑیں اس قدر اپنی تہذیبی و تمدنی اقدار میں پیوست ہیں۔ میرے ذہن میں تین نام آتے ہیں۔ فیض، اختر الایمان اور سردار جعفری۔ اس عہد کی تہذیبی تثلیث ان تینوں سے تیار ہوتی ہے۔ اگر اختر الایمان کو حذف کر دیں تو صرف دو نام رہ جائیں گے جن کے یہاں آفاقی انسانیت و ہمدردی اور اپنی تہذیبی قدروں کے عناصر کار فرما نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی اور اسلامی تہذیب میں عورت کا ایک اونچا اور پاکیزہ مقام رہا ہے۔ سردار جعفری نے 'عورت' کی تقدیس اور حرمت کو سمجھا۔ ترقی پسندوں کا نظریہ یہ تھا کہ مزدوروں کے بعد اس روئے زمین پر سب سے زیادہ مظلوم و مقہور 'عورت ذات' رہی ہے۔ اردو شعر و ادب میں عورت کو خواہشات اور تلذذ کا آلہ تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اسی ذہنی عیاشی کے سبب شاعر مشرق نے کہا تھا:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ترقی پسندوں نے عورت کو اپنے حقوق اور سماجی انقلاب کے لیے تیار کیا:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جس ہندوستانی عورت میں حد درجہ حیاداری اور گریہ و زاری تھی ترقی پسندوں نے اسے کمربستہ ہونے کے لیے تیار کیا۔ گویا تہذیب کی کسوٹی کچھ بدلتی نظر آئی۔ سردار جعفری کی نظم 'نئی دنیا کو سلام' بھی اسی نوع کی انقلابی عورت کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس عورت میں خود ضبطی اور خود شناسی کا جوہر ہے۔ نظم کا آغاز دیکھیے:

سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے
سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ چیخیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے

جس تیرگی اور سیاہی کا یہاں نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ افکار انسانی کے بطن سے پھوٹتی ہے۔ تہذیب انسانی جب سیاہ ہو جاتی ہے تو اسی طرح کی تیرگی پھیلتی جاتی ہے اور پھر ایک دن اس کے حصار میں پوری کائنات آ جاتی ہے۔ جاوید اپنی محبوبہ (بیوی) سے درد بھرے انداز میں کہتا ہے:

تو بھی بنگال کی سینکڑوں عورتوں کی طرح
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی چلتی
ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں
میں، جن میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں۔

اس حصے کو پڑھ کر معاشرے کی ننگی اور کھوکھلی تہذیب سامنے آ جاتی ہے۔ اس نظم میں جو ڈرامائی اور مکالماتی انداز اختیار

www.taemeernews.com

کیا گیا ہے وہ بہت ہی پر اثر ہے۔ عورت کی جاں نثاری، داخلی کیفیات، مر مٹنے کا جذبہ، پیٹ میں پل رہے بچے کو ارتقائے کائنات کا حصہ تصور کر کے اپنے لطیف احساسات کو لفظوں کا پیکر عطا کرنا اور فرطِ انبساط سے سرشاری اور خود حفاظتی کے لیے ہمہ وقت چوکنا رہنا۔ یہ سب ایسے اوصاف ہیں جو عورت کی اصل تہذیب بناتے ہیں۔ جہاں تک عورت کے تقدس کا سوال ہے سردار کی نظم "نومبر میرا گہوارہ" دیکھی جاسکتی ہے۔ ماں کا تصور تو شاید انسانی تہذیب کا مرکزی کردار ہے بلکہ اساس کہنا چاہیے۔ شاید اسی مناسبت سے کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (الجنّة تحت اقدام الامهات) اس طرح اگر غور کریں تو سردار کی ذہنی پرداخت و ساخت میں کہیں نہ کہیں اسلامی رموز و افکار کا ہاتھ بھی ضرور رہا ہے۔ عورت کی تعظیم و تکریم مشرقی تہذیبی رویے کی اہم کڑی ہے۔ نظم دیکھیے:

مری ماں
اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی
ننھے سے کھلونے کو
مری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں
پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا
وہ چہرہ کیا تھا
سورج، خدا تھا یا پیمبر تھا
کہ اس چہرے سے بڑھ کر خوبصورت
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا
جو اپنے دل کے خوابوں
پیار کی کرنوں سے روشن تھا

علامہ اقبال نے بھی تسلیم کیا تھا:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

سردار جعفری کو اپنی تہذیب اور اپنے وطن کی مٹی بہت عزیز رہی ہے۔ فساد زدہ معاشرے میں جو شقاوتیں نظر آتی ہیں، ان کو سردار جعفری نے اپنی نظم 'رومان سے انقلاب تک' (مجموعہ: 'خون کی لکیر') میں پیش کی ہیں۔ کہیں کہیں لہجہ ذرا بلند ہو گیا ہے مگر یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایسے ہی مناظر پر انسانی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور پھر لہجے کے بلند و پست ہونے کا خیال ہی کہاں رہتا۔ مذکورہ نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

میں نے دہلی میں پنجاب میں اپنے نغموں کی جھولی پساری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
اور انھوں نے مری گود میں
چند جھلسے ہوئے ہاتھ
ٹوٹی ہوئی ہڈیاں
خوں میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں
روٹیوں کو کبھی میں نے چاند اور سورج سے تشبیہ دی اور کبھی
رنڈیوں سے

اس نظم میں آگے چل کر انداز کچھ زیادہ ہی خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ اس انداز سے شعری لطافت مجروح ہوتی ہے، جس کے سبب نری جذباتیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہاں پر سردار جوش کی طرح گھن گرج سے کام لیتے ہیں۔ دراصل یہ کام اور انداز جوش ہی کو زیب دیتا تھا۔

سردار کی ایک نظم ہے 'فریب' (مجموعہ: خون کی لکیر) جس میں انھں نے علامتی طرز اظہار کو اپنایا ہے۔ سماج اور تہذیب کی بدہیئتی اور کریہہ صورت کو اس نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں ان کی تخلیقی بصیرت اور تمثیلی تخلیقیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ نظم کے حصہ ۲ سے یہ ٹکڑا دیکھیے:

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے
بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے

www.taemeernews.com

مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بد بخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ترقی پسند تحریک دراصل استحصال کے خلاف ایک آواز تھی۔ کسان، دھرتی، مزدور اور یہاں کی بھوک سے نڈھال جنتا۔ ان موضوعات پر ترقی پسندوں نے اپنی تخلیقی قوت صرف کی۔ سردار نے اپنی نظم 'جمہور' میں اپنی نفرت کو تیز کر کے دکھایا ہے مگر پھر بھی جذباتیت سے اس نظم کو بچانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ جو اشیا اور معدنیات، جو فصلیں اور اناج اس وطن میں ہے وہ ہماری تہذیب کے عوامل کہے جا سکتے ہیں جن کی شناخت آسان بھی نہیں کیوں کہ ان عوامل اور تہذیبی بساط کے درمیان جو انسلاکات ہیں وہ کہیں تو واضح ہوتے ہیں اور کہیں بالواسطہ ہونے کے سبب ان کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ نکڑا دیکھیے:

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں
اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان
کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان
یہ گنگا کا آنچل یہ جمنا کا ریت
یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت
ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے
وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے
جسے دیکھو مفلس ہے کنگال ہے
ہر اک شہر ہر گاؤں بنگال ہے
کہیں ماؤں بہنوں کا ہے مول تول
کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول

نظم کا دوسرا حصہ 'جمہور کا اعلان نامہ' ہے جس کا آغاز علامہ اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' کے چند مصرعوں سے ہوتا ہے۔ نظم ارتقا پذیر ہوتی ہے اور پھر ایک امید افزا کرن دکھائی دیتی ہے جو بطنِ تہذیب کی تیرگی دور کر دے گی۔ چند مصرعے پیش کیے جاتے ہیں:

ہمیں سے ہیں تہذیب کے نقش و رنگ
ہمیں سے تمدن کے دل کی امنگ
ہماری ہی قوت سے چلتے ہیں مل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل
یہ دولت ہے میراث انسان کی
زمیں پر حکومت ہے دہقان کی
ملوں پر ہے مزدور کا اختیار
وطن پر ہے جمہور کا اختیار
ہماری کسوٹی ہے انسانیت
اخوت، مساوات اور حریت

اخوت، مساوات اور انسانیت ایسے عوامل ہیں جو سردار کو اسلامی تعلیمات کے قریب کر دیتے ہیں۔ مسلم معاشرے کی تہذیبی شناخت انہی عوامل سے قائم ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اسی طرح کی بات کہی تھی:

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

سردار جعفری انسان اور انسانیت کی بقا کو ضروری سمجھتے رہے۔ ان کا ماننا تھا کہ انسان کی جد و جہد اور محنت اس کے ماحول کی خالق بھی ہوتی ہے۔ انسان اس لیے سب سے زیادہ حسین اور عظیم المرتبت ہے۔ اسی پس منظر میں ان کی نظم 'ہاتھوں کا ترانہ' (مجموعہ: ایک خواب اور) پڑھی جا سکتی ہے۔ ان دو ہاتھوں کی مدد سے دنیا کا نظام چل رہا ہے اور مختلف علوم و فنون کے نمونے بھی سامنے آ رہے ہیں۔ 'ہاتھوں کا ترانہ' ایک خوبصورت نظم ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

www.taemeernews.com

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں، کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

سردار جعفری کی ایک بڑی خوبی ان کے اندر پایا جانے والا فکری اعتماد ہے۔ انھیں اپنے احساس اور اپنی فکر کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے کسی طرح کا کنفیوژن نہیں ہوتا۔ ان کی نظم 'ایشیا جاگ اٹھا' (۱۹۵۰ء) کا مطالعہ کیا جائے تو مشترک تہذیبی و ثقافتی رنگ سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں سوچ وسیع کینوس پر پھیل گئی ہے جس کے نتیجے میں بڑی تہذیب تشکیل پاتی ہے۔ یہاں سردار جعفری کا تہذیبی شعور موجود تاریخی عوامل و نشانات سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ نظم میں کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا، نہ موضوع کے لحاظ سے اور نہ ڈکشن اور پیش کش کے لحاظ سے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سردار جعفری دنیا بھر کی سیر کرتے رہنے کے باوجود، میٹرو پولیٹن سٹی میں زیادہ وقت گزارنے کے باوجود اپنی دھرتی کی باس اور کسان اور مزدور کے مسائل سے ذہنی طور پر دور نہیں ہو سکے۔ ان کا تاریخی پس منظر وسیع اور مستحکم ہے ساتھ ہی شفاف بھی، اسی لیے تہذیبی بصیرت میں بھی شفافیت ملتی ہے۔ 'ایشیا جاگ اٹھا' کا یہ حصہ دیکھیے:

یہ ایشیائی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی سامنا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل، انصاف اور محبت کے راگ
چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰ کے سر پر چمک چکا ہے

ہمارا ورثہ منجو دازو سے دیوارِ چین تک ہے
ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرام مصر تک ہے

ہمیں روایات کے خزانوں سے بابل و نینوا ملے ہیں
زبان کھولی تو وید، انجیل اور قرآن بن کے بولے

یہاں پروفیسر احتشام حسین کا یہ قول پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے تہذیبی پس منظر کی اہمیت اور اس کی تفہیم آسان ہو جائے گی:

"ہر ملک و قوم کا کوئی نہ کوئی تہذیبی سرمایہ ہوتا ہے، چاہے وہ قوم بہت زیادہ متمدن نہ کہی جا سکے پھر بھی وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ بنیادیں رکھتی ہیں... اس کے گیت، رقص، موسیقی، قصے، کہانیاں، ضرب الامثال سب اس کے وجود کا جزو بھی ہیں اور مظہر بھی۔"

(بحوالہ: ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر: قمر رئیس، ص: ۲۰۰)

اس طرح سردار کی نظموں میں ہندوستانی، حکائی واسطوری تلازمات کی واضح نشانیاں مل جاتی ہیں۔ مور کا خوشی سے رقص کرنا، پیپل کے نیچے پتھر کے دیوتا کا ہونا، برگد کی جٹاؤں کا ذکر، کسانوں کے کھردرے ہاتھ، لوہار کا گھن، کمہار کا چاک، آنگن میں دوپٹے کا ٹنگا ہونا اور پھر خاک اودھ کا اپنی طرف بلانا... سردار کے تاریخی و تہذیبی شعور کے پختہ ہونے پر دال ہیں۔ ان کی نظموں کے تہذیبی رویے صاف ہیں۔ ان کی فکری و تہذیبی اساس پر کسی طرح کے تصنع کی دھند نہیں۔

اردو کے بیشتر شعرا نے مغربی تہذیب سے اختلاف کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کی تو پوری شاعری ہی مغربی تہذیب اور فکر کے ردعمل میں وجود میں آئی۔ علامہ اقبال نے بھی مغربی تہذیب کو شاخ نازک پر بنے آشیانے سے تشبیہ دی۔ مگر سردار جعفری نے یہاں وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے مشرق و مغرب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل ان کا مقصد ہمہ گیر اخوت ہے بلکہ تہذیب کی ہمہ گیری ان کے لیے اہم ہے۔ انسانیت کو وہ تمام تہذیبوں کا نچوڑ تصور کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خیر کو شر پر فاتح دیکھنا چاہتے ہیں۔ نظم 'مشرق و مغرب' کے کچھ حصے ملاحظہ کیجیے:

زندگی ایک، زمیں ایک ہے انسان بھی ایک
فکر کا بحر بھی جذبات کا طوفان بھی ایک

www.taemeernews.com

شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک
دل جو سینے میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک
ہیر مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں
جولیٹ روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں
باغ مشرق ہو کہ مغرب ہو، ہوا ایک سی ہے
سرد یا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے

ٹیمس اور سین میں جمنا کی سی بیتابی ہے
موج ڈینوب میں گنگا کی سی بے خوابی ہے
دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے
ہند و ایراں کی طرح طفل جواں ہوتا ہے

سردار جعفری کی نظموں میں جو انسانی عظمت اور تہذیب کے نقوش ملتے ہیں، اگر ان کے ہم عصروں میں تلاش کریں تو کچھ ایک میں یہ نقوش ملیں گے۔ حالاں کہ سردار کی کچھ نظمیں بھی انقلاب اور گھن گرج کی زد میں آگئی ہیں مگر چوں کہ ان کا تاریخی اور تہذیبی شعور بالیدہ اور پختہ تھا اس لیے انھوں نے خود کو بچایا۔ بحیثیت قائد سجاد ظہیر کے بعد سردار جعفری کو ہی تسلیم کیا گیا مگر فن اور تخلیقی بصیرت کے لحاظ سے سردار کو سجاد ظہیر پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے۔ اردو نظم نگاری میں سردار نے کئی اہم کامیاب تجربے بھی کیے۔ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور خوشی کی بات ہے کہ مستعار اور رٹے ہوئے [illegible] ان کا ایمان نہیں تھا۔ ان کی تخلیقی بصیرت ہمیشہ اپنی تہذیبی، ثقافتی پونجی اور اس کے تلازموں پر مرکوز رہی۔ جس فنکار کی تہذیبی و تمدنی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں، اس کا فن پارہ ہمیشہ معاشرے اور زمانے کو روشنی دیتا ہے۔ سردار کی بیشتر نظمیں تہذیب اور اپنی ثقافت اور اس کے متعلقات کو پیش کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کی صحیح تفہیم کے لیے تہذیبی سروکار تک رسائی شرط اولین ہے۔

□□□

□□□

زیر نظر تصویر میں علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، کرشن اور سلمیٰ صدیقی محو گفتگو

www.taemeernews.com

نوحہ

(علی سردار جعفری کے انتقال پر)

مختار ٹونکی

سبب نہ پوچھو اداسیوں کا
رہینِ غم ہوں، اسیرِ حرماں
مرے وطن کا عظیم شاعر
مرے وطن کا عظیم انساں
جو چل بسا ہے، جو کھو گیا ہے
یہ میری آنکھیں بھگو گیا ہے

ابھی تو گل سا مہک رہا تھا
ابھی تو گلشن میں تھا وہ خنداں
جو مثلِ بلبل چہک رہا تھا
ابھی تو محفل میں تھا غزل خواں
وہی تو خاموش ہو گیا ہے
یہ میری آنکھیں بھگو گیا ہے

جلا رہا تھا چراغ بے شک
ادب کی دنیا میں جو سخن کے
جلا دئے تھے رنگ جس نے
ہماری دنیا میں فکر و فن کے
غضب خدا کا وہ سو گیا ہے
یہ میری آنکھیں بھگو گیا ہے

وہ اپنے سچے نشاطِ فن سے
دلوں میں خوشیوں کو بھرنے والا
وہ اپنے شعروں کی تازگی سے
دلوں کو بیدار کرنے والا
دلوں میں نشتر چبھو گیا ہے
یہ میری آنکھیں بھگو گیا ہے

رہے گا زندہ ہمارا شاعر
بھلا سکے گا نہ یہ زمانہ
ادب سے سردار جعفری کو
مٹا سکے گا نہ یہ زمانہ
خلا میں گرچہ وہ کھو گیا ہے
یہ میری آنکھیں بھگو گیا ہے

نظر میں ہوں گے اسی کے جلوے
رکھیں گے دل میں اسی کی یادیں
اسی کے چرچے ہوا کریں گے
سدا رہیں گی اسی کی باتیں
جو بحرِ غم میں ڈبو گیا ہے
جو میری آنکھیں بھگو گیا ہے

کالی پلٹن روڈ، پلہ محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

www.taemeernews.com

علی سردار جعفری — چند تاثرات

راشد انور راشد
222/2، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی 110025

غالباً اس بات کو سات سال ہو گئے۔ ایک ضروری کام سے مجھے اپنے ایک سینئر دوست کے ہمراہ پاکستانی ایمبیسی جانے کا اتفاق ہوا۔ حسب معمول وہاں کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ عجیب افرا تفری کا عالم تھا۔ اتفاق سے چند کرم فرماؤں کی بدولت ہمارا کام جلد ہی ہو گیا۔ ہم واپس جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ ایک شناسا چہرے پر نگاہ پڑی۔ علی سردار جعفری کو خاصہ پریشان دیکھ کر ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ ہم دونوں ان کے قریب گئے اور بڑے احترام سے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے بتایا کہ ایمبیسی میں انھیں کسی صاحب سے فوراً ملنا ہے لیکن دربان مسلسل اصول و ضوابط کا حوالہ دے رہا ہے اور اندر جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کا تعارف جاننے کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی کہ اس عہد کی مقبول ترین شخصیت کو ایک عام انسان کے ذریعہ اس طرح نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے؟ ہم دونوں فوراً دربان کی طرف لپکے اور مختصر طور پر سردار جعفری کی بھاری بھرکم شخصیت اور زبردست اہمیت سے اسے روشناس کرایا۔ اتفاق سے ہماری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں اور تھوڑی دیر بعد ہی جعفری صاحب کا کام ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرنے میں انھیں خود بھی دلچسپی نہ ہو، ورنہ کوئی وجہ نہیں بنتی کہ اس طرح کی دشواریاں پیش آئیں۔

اس کے بعد جعفری صاحب جب بھی دہلی آئے میں ان سے برابر ملتا رہا۔ انھوں نے ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ محبت اور اپنائیت کا ثبوت پیش کیا۔ علی سردار جعفری سے ذہنی اور جذباتی طور پر قریب آنے کے بعد ہی مجھے اس بات کی صداقت کا علم ہوا کہ جو پیڑ زیادہ پھل دار ہوتا ہے، اس کی شاخیں جھکی ہوتی ہیں تاکہ کوئی بھی بیش قیمتی پھلوں کے بے مثال ذائقے سے لطف اندوز ہو سکے اور حسب ضرورت اس کی ٹھنڈی اور نرم چھاؤں میں ستا سکے۔ آج جعفری صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھوں میں عجیب سی لرزش ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک اور ادب کے آخری چراغوں میں سے تھے۔ ان کی موت سے یقیناً ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

زندگی کے ابتدائی سفر سے آخری وقت تک سردار جعفری کی زندگی دھوپ چھاؤں اور اتار چڑھاؤ سے مسلسل دوچار رہی۔ انھوں نے اصول کی خاطر زندگی کی تمام تر آسائشیں ٹھکرا دیں، مصلحت پسند دنیا سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور ہمیشہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ جینوین فنکار زندگی کے کسی موڑ پر اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا اور یہی اضطرابی کیفیت اسے بہتر سے بہتر کی تلاش میں ثابت قدم رکھتی ہے۔ سردار جعفری کی زندگی عملی جدوجہد کا بے مثال نمونہ تھی۔ ان کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ درد کی لہروں میں ان کی کشتیِ حیات ڈوبتے ابھرتے کسی طرح طمانیت کے ساحل سے ہم کنار ہونے کو مضطرب ہے۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ بہت سنجیدگی کے ساتھ شعر و ادب کے مطالعے اور تصنیف و تالیف میں گزارا اور اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے کلاسیکی اور جدید ادب کے مطالعے میں ہمیشہ غرق رہے۔ وسیع مطالعے نے ان کے اندر زندگی کو نئے تناظر میں دیکھنے کا شعور پیدا کیا۔ مختلف ممالک کے متعدد سفر نے بھی تجربات و مشاہدات کی سطح پر ان کے شعور میں ایک نئی دنیا آباد

www.taemeernews.com

کی۔ ان کی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا بیان بہت بے باکی کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا مطالعہ قابل رشک ہے پھر بھی ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ کاش میں نے اور زیادہ کتابیں پڑھی ہوتیں، کاش مجھے اور بہتر شاعری کا موقع ملتا۔ اسی احساس نے انھیں فکر اور عملی جدوجہد کی سطح پر مزید سرگرم رکھا۔

عہد جوانی میں ذہن و دل پہ جوش اور ولولہ کچھ زیادہ ہی حاوی تھا جس کا خمیازہ انھیں ہر محاذ پر بھگتنا پڑا، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور حوصلے کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ ان کے اندر خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انانیت بھی مزاج میں شامل تھی لیکن اسے بے جا انانیت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ وہ انانیت تھی جس کا رشتہ خود کی شناخت کے مثبت پہلو سے قائم کیا جاسکتا ہے، اور اسی انانیت نے انھیں مصلحت پسند دنیا کے آگے کبھی جھکنے نہیں دیا۔ دورانِ تعلیم انھیں طرح طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں ایم۔اے کے دوران انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمی کے جرم میں انھیں یونیورسٹی سے نکلنا پڑا۔ تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے انھوں نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے سال اول کا امتحان پاس کرلیا لیکن حالات کی ستم ظریفی نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ ۴۰۔۱۹۳۹ء میں اپنی شاعری میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے میں انھیں امتحان میں نہیں بیٹھنے دیا گیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد بھی انھیں سکون نصیب نہیں ہوا اور بلرام پور میں نظربند کردیا گیا۔ اس طرح سردار جعفری کی باضابطہ تعلیم کا جو سلسلہ منقطع ہوا تو پھر کبھی اس کی تکمیل نہیں ہوسکی۔ لیکن وہی علی گڑھ جہاں سے کبھی انھیں نکال باہر کیا گیا تھا، اسی یونیورسٹی نے اپنے اس عظیم سپوت کو ۱۹۸۶ء میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ سردار جعفری کا خیال تھا کہ اگر کسی میں جینوین صلاحیت ہے تو وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود اپنا لوہا منوالے گی۔ خود ان کی زندگی میں نمایاں کامیابیوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔

عملی سیاست میں دلچسپی کے باعث انھیں کئی موقعوں پر قید و بند کی سزائیں بھگتنی پڑیں لیکن ان آزمائشوں سے ان کی نظریاتی وابستگی اور پائے استقلال میں کبھی کوئی لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے زندگی بھر کوئی ملازمت نہیں کی لیکن زندگی ایک خاص شان کے ساتھ گزارتے رہے۔ زندگی کے تئیں عملی جدوجہد نے انھیں معاشی بحران سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔

تصنیف و تالیف کے معاملے میں وہ ہر لحہ بے حد سنجیدہ رہے۔ ادب، ثقافت، اور سیاست پر اردو اور انگریزی میں تین سو سے زیادہ مضامین کے علاوہ ان کے شعری اور نثری تصانیف کی تعداد پندرہ ہے۔ 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' فکشن کا بہترین نمونہ ہے اور سردار جعفری کی جادوئی نثر کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور ادب کے تعلق سے کتابیں تو بہت لکھی گئیں، لیکن جو اہمیت اور مقبولیت سردار جعفری کی تنقیدی کاوش 'ترقی پسند ادب' کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آسکی۔ چوں کہ سردار جعفری خود اس تحریک کے روحِ رواں تھے، لہٰذا ان کی یہ کتاب بلاشبہ تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ 'غالب اور اس کی شاعری' بھی ایک اہم کام ہے، جس کے انگریزی ایڈیشن میں قرۃالعین حیدر کا اشتراک شامل ہے۔ سردار جعفری نے ترتیب و تدوین میں بھی خاص دلچسپی دکھائی اور دیوانِ غالب، دیوان میر، کبیر بانی، اور پریم وانی کو بہت سلیقے سے ترتیب دے کر قدرے اہتمام سے شائع کرایا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کلاسیکی شعر و ادب کے لیے ان کے دل میں ایک خاص وقعت اور اہمیت تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن کی تشکیل میں کلاسیکی مزاج اور معیار کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 'نیا ادب' اور 'گفتگو' جیسے اہم رسالوں کی ادارت کامیابی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ ٹیلی ویژن اور فلم سے بھی ان کی وابستگی رہی اور یہاں بھی انھوں نے اپنے اجتہادی ذہن کا ثبوت پیش کیا۔

سردار جعفری صحیح معنوں میں ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں اپنے وقت کے تمام مشاہیر ادب اور سیاست سے

www.taemeernews.com

براہِ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا جس سے ان کی شخصیت میں ایک خاص نکھار پیدا ہو گیا۔ اپنے اپنے شعبوں میں نمائندہ حیثیتوں کی حامل یہ شخصیتیں صرف ہندوستان تک محدود نہیں تھیں بلکہ انھیں متعدد موقعوں پر دنیا کے اہم ترین لوگوں سے ملنے اور قریب آنے کا موقع ملا۔ لیکن انھیں عظیم شاعر علامہ اقبال سے نہیں مل پانے کا افسوس آخر تک رہا۔ جن دنوں سردار جعفری علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، علامہ اقبال ایک سمینار میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ سردار کے کئی قریبی دوستوں نے ذوق و شوق کے ساتھ اس سمینار میں شرکت کی اور سوال و جواب کے دوران شاعرِ مشرق نے تمام نوجوانوں کو علمیت اور محبت سے اپنا گرویدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سردار جعفری تساہل سے کام لیتے ہوئے بسمل میں ہی پڑے رہے۔ جب ان کے ساتھیوں نے واپس آکر علامہ اقبال سے اپنی یادگار ملاقات کا ذکر کیا تو سردار جعفری اپنا من مسوس کر رہ گئے، اور بدقسمتی سے آئندہ ملاقات کی پھر کوئی سبیل نہیں نکل پائی۔ قریبی احباب سے گفتگو کے دوران جعفری صاحب اس تشنگی کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔

سردار جعفری ان معنوں میں خوش قسمت رہے کہ زمانے نے ہر قدم پر ان کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ اپنے نظرانداز کیے جانے کا غم انھیں کبھی نہیں رہا۔ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، پدم شری اور بہت سے انعامات کے علاوہ انھیں مجموعی خدمات کے لیے گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فراق گورکھپوری ('گل نغمہ' شاعری) اور قرۃ العین حیدر ('آگ کا دریا' ناول) کے علاوہ وہ اردو کے تیسرے ادیب تھے جنھیں اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے جب ان کے نام کا اعلان کیا گیا تھا بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں کیوں کہ یہ پہلا موقع تھا جب ایک کتاب کے بجائے مجموعی خدمات کے لیے کسی ادیب کو اس اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاعر کے بجائے نثر نگار کی حیثیت سے سردار جعفری کی شخصیت زیادہ بھاری بھرکم تھی۔ ممکن ہے اس خیال میں صداقت بھی ہو، لیکن 'پتھر کی دیوار' 'لہو پکارتا ہے' 'امن کا ستارہ' اور 'ایک خواب اور' کی بعض نظمیں شعری سطح پر بھی ہمیں اپنا شیدائی بننے کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں میر، غالب، انیس اور اقبال سے خاطر خواہ اثر قبول کیا ہے۔ لفظیات کی سطح پر جو چستگی ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ ان کے کلاسیکی مزاج اور شعور کی پختگی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ہر چند ان کی غزلوں میں وہ دھار دار کیفیت دیکھنے کو نہیں ملتی لیکن نظموں میں بلاشبہ انھوں نے ایک نئی راہ نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے جس کی بنا پر شاعروں کی بھیڑ میں سردار جعفری کی آواز پہچاننے میں ہمیں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں ایک طرف انھوں نے اقبال کی مانند پابند نظموں میں اپنی فن کاری اور مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف ان کی اچھی خاصی نظمیں آزاد ہونے کے باوجود قاری کے ذہن و دل پر دیرپا تاثر چھوڑتی ہیں اور ہم ان نظموں کے جادوئی سحر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پاتے۔

سردار جعفری کی شاعری میں زمین اور مٹی کی خوشبو قدم قدم پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ بمبئی جیسے صنعتی شہر میں طویل مدت گزارنے کے باوجود وہ تیز رفتار مشینی زندگی کا حصہ کبھی نہیں بن پائے۔ ان کے ذہن میں یادوں کا وہی قافلہ محوِ سفر رہا جو گاؤں اور بچپن کے غیر معمولی جذبات و احساسات کا آئینہ دار تھا۔ سردار جعفری اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ جب تک فن پارے میں اپنی مٹی سے لگاؤ کا احساس شامل نہیں ہوگا، پڑھنے والا ان محسوسات میں کبھی شریک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اس کسوٹی کو اپنے پیشِ نگاہ رکھا اور اپنی تخلیقات میں ان یادوں کو پوری شدت کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی جو شاید گردشِ زمانہ کے سبب وقت کی گرد سے دھکتی چلی جاتیں۔

سردار جعفری اپنی شاعری کے ذریعہ آنکھوں کے بجھتے ہوئے دیوں میں ہر لمحہ زندگی کی چمک برقرار رکھنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ آس کی ننھماتی لو کا تحفظ ان کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے کیوں کہ اس ضمن میں ذرا سی کوتاہی

www.taemeernews.com

اپنے آپ کو زندہ دفن کرنے کے مترادف ہے۔ ہاتھوں کے کنول ان کی شاعری میں شگفتہ پھولوں کی مانند کھلتے بھی ہیں اور حالات کی ستم ظریفی سے ان کی شادابی اثر انداز بھی ہونے لگتی ہے۔ زندگی کا یہ متضاد رویہ موجودہ عہد کا زبردست المیہ ہے اور ہر فرد اس جال میں الجھا دکھائی دیتا ہے، جس سے نجات کی کوئی سبیل نہیں۔ کیا زندگی کا کارواں بے سمت منزلوں کی طرف یونہی بھٹکتا رہے گا؟ کیا سفینۂ غم دل کسی مقام پر جا کر نہیں تھمے گا؟ لیکن ہزار دشواریوں کے باوجود امید کی ہلکی سی کرن جب اپنے وجود کا احساس کراتی ہے تو دل کو یک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے کہ شاید مصائب کی تاریکیوں سے جلد ہی نجات ملے گی، شاید سحر کا کارواں بہت جلد دلوں پر دستک دے گا۔ سردار جعفری نے اپنی شاعری میں مخصوص کیفیات کی تصویر کشی کے لیے جو علامتیں استعمال کی ہیں، جن استعاروں کا سہارا لیا ہے، اور ذہن میں پوشیدہ منظر کی ہو بہو عکاسی کے لیے لفظیات کا تانہ بانہ جس طرح بنا ہے، اس سے کائنات کا ایک وسیع منظرنامہ پوری طرح روشن ہو جاتا ہے۔ فطرت سے انھیں گہرا لگاؤ ہے جس کا اظہار اپنی نظموں میں انھوں نے مختلف شکلوں میں کیا ہے۔

سردار جعفری کی نظموں میں عام طور پر مکالماتی فضا دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان نظموں میں ان کا انفرادی ذہن مشترک محسوسات کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ان کا انفرادی سفر پوری انسانیت کے ازلی اور ابدی سفر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اپنی مشہور زمانہ نظم 'فرانسو' میں انھوں نے جن کیفیات کا اظہار کیا ہے اس کے آئینے میں ہم ماضی، حال اور مستقبل کے لامتناہی سلسلے کا عکس بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں۔ وقت کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔ آن کی آن میں سب کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ کلیوں کی طرح سے کھلتی اور پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی ساری من موہک صورتیں کالے سمندر کی تہہ میں کھو جاتی ہیں۔ خون کی گردش تھم جاتی ہے، سانس کی دھار کٹ جاتی ہے، جسم سے روح کا رشتہ باقی نہیں رہتا۔ کائنات کی ساری رونقیں ماند پڑنے لگتی ہیں، زندگی کے خوبصورت کنول کمھلانے لگتے ہیں۔ یادوں کے بت خانے میں کچھ بھی سلامت نہیں رہتا۔ اس کے باوجود سازگار حالات کی امیدیں ذہن کے کسی گوشے میں کروٹیں لیتی ہیں۔ جب بھی دل میں امنگیں جاگیں گی، سردار جعفری کی نظم 'میرا سفر' احساس کے تاروں کو ہمیشہ چھیڑتی رہے گی۔ بالخصوص نظم کے اختتام میں سردار جعفری نے محسوسات کو جو گویائی عطا کی ہے، اس کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگ حنا، آہنگ غزل
انداز سخن بن جاؤں گا
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے۔

علی سردار جعفری بلاشبہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ہمعصر شاعروں کے مابین ان کے معیار اور مقام کے متعلق آرا میں اختلاف ممکن ہے لیکن جہاں تک ان کی مجموعی شخصیت کا سوال ہے تو اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ان کا قد اپنے ہمعصروں میں سب سے بلند تھا۔

□□□

www.taemeernews.com

امیدِ فردا کا شاعر ــــ علی سردار جعفری

سرور الہدیٰ

103-کاویری ہاسٹل جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

علی سردار جعفری کی شاعری کا مطالعہ ادب کے ایک غیر جانب دار طالب علم کی حیثیت سے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کے شعری امتیازات کی نشان دہی ہو سکے۔ سردار جعفری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو سردار کے نظریات سے سخت اختلاف رکھتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو سردار کے نظریات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اختلاف رکھنے والوں سے سردار کے سلسلے میں ناانصافی بھی ہو سکتی ہے اور قدر کرنے والوں سے جانب داری بھی۔ اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اتفاق اور اختلاف کی وجہ سے تحریر میں توازن قائم نہیں رہ پاتا۔ کسی شاعر کی شاعری کا مطالعہ اگر صرف شاعری کو سامنے رکھ کر کیا جائے اور ذہنوں سے وہ باتیں نکال دی جائیں جو پہلے سے اس کی شاعری کے سلسلے میں رائج ہیں تو اس سے متن اور صاحب متن دونوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا بہت ہوتا ہے کہ کسی شاعر کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے عام ہو جاتی ہے تو عموماً اس کو سامنے رکھ کر رائے قائم کی جاتی ہے۔ اور یہ رائے بھی سرسری مطالعہ پر مبنی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کچھ علی سردار جعفری کی شاعری کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ علی سردار جعفری ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کے یہاں نعرہ ہے، شور ہے، ہنگامہ ہے، اعلان ہے، تبلیغ ہے، تلقین ہے وغیرہ۔ میرے ایک دوست علی سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ سردار کی شاعری نعرہ یا ہنگامہ بازی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے دعوے کی دلیل میں ان چند نظموں کو پیش کرتے ہیں جن میں واقعی احتجاج کی لے بہت تیز ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک ایسا شاعر جس کی شاعری ساٹھ ستر سال کے طویل عرصے پر محیط ہے اس کی چند نظموں کو بنیاد بنا کر پوری شاعری پر خاک ڈال دینا ادبی بددیانتی ہے۔ کسی شاعر کے یہاں اچھی یا خراب مثالیں ملتی ہیں۔ ہمارے لوگ تنگ پسندی کے اس قدر شکار ہیں کہ صرف سرسری مطالعہ کرکے ہی شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی اور شارب ردولوی بننا چاہتے ہیں۔ ان بزرگوں کے نظریات سے تو ہم اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کی علمیت اور فکری بصیرت سے انکار نہیں کر سکتے۔

علی سردار جعفری نے ۸۶ برس کی عمر میں زندگی کی آخری سانس لی، ان کا ادبی سفر اس لحاظ سے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس درمیان ہر اچھا اور بڑا شاعر فکر و فن کی بلندیوں پر فائز ہو جاتا ہے۔ علی سردار جعفری نے ایک فکر ایک ارادے کے ساتھ اپنا ادبی سفر شروع کیا تھا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ بہت فعال اور متحرک تھے۔ انہوں نے ہنگامہ خیز اور خطرات سے پُر زندگی گذاری۔ ان کے ساتھ سفر کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے مگر کیا وجہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت سردار کے حصے میں آئی وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوئی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ترقی پسند تحریک وجود میں نہ بھی آتی تو بھی سردار کی زندگی کچھ مختلف نہیں ہوتی۔ سردار کی حد سے بڑھی ہوئی فعالیت، شدت احساس اور آواز کی بلند آہنگی نے ان کو سب سے منفرد بنا دیا ہے۔ وہ کئی بار جیل بھی گئے کالج اور یونیورسٹی سے نکالا بھی گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ سردار کے ساتھ کیوں ہوا۔ کیا وہ وقتی شہرت اور عزت کے خواہاں تھے۔ کیا وہ سیاست میں اپنے لئے کوئی جگہ بنانا

www.taemeernews.com

چاہتے تھے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ٹی. ایس. ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دنیا کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے سیاست دانوں کو ادب سکھا نہیں دیا جاتا۔ علی سردار جعفری کا سیاست سے گہرا لگاؤ دراصل اسی رویے کو ظاہر کرتا ہے وہ سیاست دانوں کو ادب سکھا سکے یا نہیں یہ ایک دوسری بات ہے مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ سردار نے سیاست کی گھناؤنی اور مکروہ پیشہ کو طنز کا نشانہ بنایا اور اپنی شاعری کے ذریعہ حکومت اور سیاست کا ایک ایسا خوش نما پیکر پیش کیا جو سب کو بھلا معلوم ہو۔ بہت سے ایسے شعراء ہیں جن کے یہاں سیاسی شعور موجود ہے مگر ان کا رشتہ سیاست سے صرف ذہنی ہے عملی نہیں۔ اس لئے وہ جب اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں تو اس میں ایک ٹھہری ہوئی فضا ہوتی ہے مگر وہ لوگ جن کا رشتہ سیاست سے عملی ہے وہ اپنے اظہار بیان میں شدید ہوتے ہیں۔ سردار جعفری سیاست کی چال بازیوں اور مکاریوں کے تماشائی نہیں تھے بلکہ وہ اس کے شکار بھی ہوئے سیاست کی غلط پالیسیوں اور حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی انہیں قیمت بھی ادا کرنی پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سیاست اور حکومت کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تو اس میں احتجاج کی لے تیز ہو جاتی ہے۔ سردار جعفری نے جیسی زندگی گزاری تھی شاید اس کا تقاضہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہم میدان سے باہر کے لوگ ان کے جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس نہیں کر سکتے جو میدانِ عمل میں دشمنوں سے سینہ سپر ہے۔ خطرات سے پُر زندگی گزارنے والے تخلیق کار کی تخلیق کا کرب کیا ہے اس کا اندازہ ان کی ایک نظم "تخلیق کا کرب" سے کیا جا سکتا ہے:

ابھی ابھی میری بے خوابیوں نے دیکھی ہے
فضائے شب میں ستاروں کی آخری پرواز
خبر نہیں کہ اندھیرے کی دل کی دھڑکن ہے
کہ آ رہی ہے اجالوں لے پاؤں کی آواز
بتاؤں کیا تجھے نغموں کے کرب کا عالم
لہولہان ہوا جا رہا ہے سینۂ ساز

سردار جعفری کی پوری شاعری اس بات کی غماز ہے کہ وہ کسی بھی دور میں انسان کی آرزوؤں، تمناؤں، دکھوں اور محرومیوں سے بے نیاز نہیں رہی۔ اس نے اپنا مواد اور موضوع براہ راست زندگی سے حاصل کیا ہے۔ ادب میں بہت سارے رجحانات اور میلانات داخل ہوتے رہے مگر سردار جعفری اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کر سکے کہ اس زمین کی خوبصورتی اور بدصورتی کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ سردار جعفری کی شاعری انسانوں کے دکھ درد سے ہی تحریک پاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان تمام مسائل کو دیکھا جا سکتا ہے جو وقفے وقفے سے سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ کوئی شاعری اپنے عہد کے مسائل و میلانات سے اس قدر ہم آہنگ ہو۔ سردار جعفری کی شاعری کا رشتہ سماج اور معاشرے سے اتنا گہرا اس لئے ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ زندگی سے پھوٹتی ہے اب یہ دوسری بحث ہے کہ زندگی کے واقعات و حادثات کو شاعری میں کس طرح پیش کیا جائے حقیقت کا بیان جب جمالیات کا نقاب اوڑھ لیتا ہے تو اس میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حقیقت ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ ادب بھی بن جاتی ہے۔ ترقی پسند شاعری سے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ وہ حقیقت زیادہ ہے اور شاعری کم مگر یہ الزام پوری ترقی پسند شاعری پر صادق نہیں آتا۔ سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں بھی یہ رائے عام رہی ہے کہ ان کی شاعری وقتی اور ہنگامی ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات سے بھی اس رائے کو تقویت پہنچی ہے مگر سردار جعفری کی پوری شاعری اس الزام کو برداشت نہیں کر سکتی ہمیں نہیں معلوم کہ شاعری کب آفاقی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور وہ حال کو عبور کر کے مستقبل میں داخل ہو جاتی ہے سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات سے یہ شبہہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ جلد ہی اپنا رنگ کھو دے گی مگر میرا خیال ہے کہ جس شاعری کو ہم جلد بازی میں وقتی اور ہنگامی کہہ کر اس کے مر جانے کی بات کہتے ہیں وہ شاعری بھی کسی نہ کسی پہلو سے اپنی معنویت باقی رکھتی ہے۔ میر نے کہا تھا۔

www.taemeernews.com

شباں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
ان ہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

یہ شعر کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کررہا ہے مگر اس کے باوجود دوسرے مفاہیم بھی رکھتا ہے مثلاً بادشاہ کی وقتی آسائش اس کا رعب و دبدبہ ظلم و ستم اور غرور و ناز وغیرہ وقتی اور ختم ہو جانے والی چیزیں ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری میں اگر وقتی عناصر ہیں تو ایسا نہیں ہے کہ آنے والے دنوں میں ان کی معنویت ختم ہو جائے گی۔ سردار جعفری کی ایک نظم "گفتگو" ہے جس کے نیچے لکھا ہے "ہند و پاک دوستی کے نام"

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے
ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دُشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بہ پا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے
صبح تک ڈھل کے کوئی حرف وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی
اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اٹھ جائے گی، مہمان مروت ہوگی
ہات میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لئے
تحفہ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

اس نظم میں کون سی وقتی اور عصری حقیقت ہے جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گی بات سے بات چلے، صبح تک شام ملاقات چلے، ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے یہ باتیں ختم ہو جانے والی ہیں اس طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جو سردار کے یہاں بظاہر وقتی معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ ان پر عنوانات قائم ہیں مگر ان کو پڑھنے کے بعد وسعت اور پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ سردار کی باتوں کی اہمیت اس لئے بھی باقی رہے گی کہ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں اور غزلوں میں انسان کی بنیادی ضرورتوں اور تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ سردار کی پوری شاعری میں ایک فکر جو ہر فکر کو جنم دیتی ہے وہ ان کی انسان دوستی ہے ملک، قوم، مذہب، مسلک، رنگ، نسل کے سارے بت ٹوٹ کر ایک بت بن جاتے ہیں اور وہ بت ہے انسانیت کا۔ ان کی ایک نظم "مشرق و مغرب" میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے ۳۸ اشعار پر مشتمل یہ نظم اتحاد و اتفاق انسانی ہمدردی رواداری اور ذہنی کشادگی کی ایک انوکھی مثال ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انسانی برادری کو ایک دھاگے میں اس طرح باندھنے کی تحریری طور پر کوئی کوشش اس سے پہلے ہوئی ہے۔ شاعر نے مشرق و مغرب کے فرق مٹانے کے لئے جتنی مثالیں اور جتنے دلائل پیش کئے ہیں وہ شاعر کی قادر الکلامی اور فکری بلندی کا احساس دلاتے ہیں۔

زندگی ایک، زمین ایک، انسان بھی ایک
فکر کا بحر بھی، جذبات کا طوفان بھی ایک
وہی سورج ہے، وہی چاند ہے، تارے ہیں وہی
نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی
شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک
دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک

فکر کا یہ انداز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ہم فیشن کا نتیجہ

www.taemeernews.com

قرار دے کر سرسری طور پر اس سے گزر جائیں۔ ہمارے لئے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ شاعر نے کیا کہا اور کیوں کہا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر کو کسی تنظیم یا تحریک کے تناظر میں دیکھ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس ایک نظم مشرق و مغرب کو ہی لیجیے تو کیا اس میں ایک وسیع تر انسانی برادری کا تصور موجود نہیں؟ کیا اس میں ایک دردمند دل رکھنے والے شاعر کا درد پوشیدہ نہیں ہے؟ کیا اس انسانی برادری کی ضرورت صرف ہمارے دور ہی کو ہے یا بعد کے زمانے کو بھی رہے گی؟ یا اس کی ضرورت ماضی میں نہیں تھی۔ محبت، اخوت، رواداری، ہم آہنگی اور امن کی باتیں کرنے والا کسی تحریک یا کسی تنظیم کا خریدار نہیں ہوتا وہ تمام عالم انسانیت کی میراث ہوتا ہے۔ ان کی فکر کے سرچشمے کیا ہیں انہوں نے کب کس سے اثر قبول کیا اس کا مطالعہ اہم ضرور ہے۔ مگر صرف متن کو سامنے رکھ کر شاعر کی جو ایک تصویر بنتی ہے وہ زیادہ اہم ہے۔

سردار جعفری کے یہاں انسانی ہمدردی کی کئی شکلیں ہیں وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور سچ کو سچ کہنا بھی انسانی ہمدردی کا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ایک آزاد نظم "کون سچ بولے گا" میں کہتے ہیں۔

کون اس عہد میں سچ بولے گا
حرف آتے ہیں قطاروں کی طرح
حکم شاہی کی طرح
اور پھر آتے ہیں کچھ اور بھی حرف
صف بہ صف دست جنوں باندھے ہوئے
ایک بھی حرف نہیں جو دل و جاں بن جائے
عہد حاضر کی زباں بن جائے
سچ تو اک درد ہے اک زخم ہے اک جرأت ہے
قید و زنداں بھی ہے سچ اور رسن و دار بھی ہے
لذت شوق بھی ہے لذت اظہار بھی ہے
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

اس نظم کا خاتمہ غالب کے مشہور مصرعے پر ہوتا ہے۔ غالب کے اس مصرعے کو جس بلند آہنگی کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے کہ

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

سردار جعفری نے غالب کے اس ایک مصرعے کے معنوی اور صوتی دونوں پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے پوری نظم کہی ہے اس نظم میں علی سردار جعفری نے حرف کے کردار پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حرف سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی حرف اپنے عہد کی زبان نہیں بن پاتا ہے تو وہ کس کام کا۔ ان تمام باتوں کے پیچھے ایک ہی فکر ہے اور وہ ہے اپنے عہد کی سچائیوں کی نقاب کشائی۔ ظاہر ہے کہ ان سچائیوں میں ایک بڑی سچائی انسانوں کے دکھ درد کا اظہار ہے۔ ان کے نزدیک انسانی ہمدردی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ موجودہ عہد کی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی جائے اس لئے کہ ظلم کا شکار عموماً وہ طبقہ ہوتا ہے جس کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے دیکھئے وہ کس طرح ظالموں کو خبردار کرتے ہیں:

اس پہ بھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے
اس پہ بھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے
کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی
آج وہ کچھ نہ صحیح کل کو جواں تو ہوگی
وہ جواں ہو کر اگر آتش صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گذرے گی

اس نظم میں لفظ "فغاں" کا ایک اہم رول ہے۔ کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی اس مصرعے سے پوری نظم کی فضا بندی ہوئی ہے۔ مگر اس نظم کا آخری مصرعہ خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی ایک واضح احتجاج بن جاتا ہے یہی وہ شکایت ہے جو سردار جعفری سے اکثر کی جاتی ہے مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ ایسی بہت ساری نظمیں ہیں جو احتجاج بھی ہیں اور شاعری کی اعلیٰ مثال بھی۔ انہوں نے اپنے خیال کے اظہار کے لئے پیکر تراشی، خوبصورت تراکیب، استعارات و تشبیہات، الفاظ کی خوش آہنگی وغیرہ۔

سردار جعفری نے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کئے بغیر وہی

www.taemeernews.com

باتیں کہی ہیں جو انہیں کہنی تھیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سردار جعفری کی شاعری میں گفتگو کا وہ انداز نہیں جو ہمیں فیض کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ فیض کی آہستگی، دھیمی دھیمی پکار قاری کو دلآویز معلوم ہوتی ہے۔ سردار جعفری اپنی گفتگو کو باوقار اور باوزن بنانے کے لئے الفاظ کی بندش کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں تیزی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں تک آواز کی بلند آہنگی کا سوال ہے تو اس معاملے میں سردار اقبال سے قریب نظر آتے ہیں۔ ایک بات جو دونوں میں مشترک ہے وہ ہے شاعری کا افادی اور تعمیری پہلو۔ دونوں کی نظر میں یہ بات زیادہ اہم تھی کہ بات کو پوری قوت سے پیش کیا جائے۔ سردار جعفری کی نظم ہاتھوں کا ترانہ ہے جس میں گفتگو کا وہی بولتا ہوا انداز ہے میرا خیال ہے سردار جعفری کی شاعری میں گفتگو کا یہ انداز ان کے اسلوب کا حصہ بن چکا ہے نظم ہاتھوں کا ترانہ سردار جعفری کی انسان دوستی کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس نظم میں جس ہاتھ کا ذکر ہے وہ ہاتھ کوئی نرم و نازک ہاتھ نہیں کہ جس نے سرد و گرم جھونکے برداشت نہ کئے ہوں۔ بلکہ یہ وہ ہاتھ ہے جو محنت کشوں کا ہے۔

جس نے دنیا میں کتنے نقش و نگار بنائے، کتنی شمعیں جلائیں، کتنے زخموں پر مرہم رکھے، اس کی تعظیم جب نہیں ہوتی تو شاعر کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ جس شخص کا ہاتھ اتنا ہنرمند اور نفع بخش ہو وہ جب بھوکا پیاسا اور پریشان حال نظر آتا ہے تو سردار تڑپ اٹھتے ہیں اور ان الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

ابھی ہے اسی جسم برہنہ کی نمائش
زخموں سے جیسے پیرہن درد ملا ہے
ہونٹوں پہ وہی خشکی افلاس کے دھبے
چہروں پہ وہی بھوک کی ٹھہری ہوئی شامیں
ہے کوئی جو ہنگامۂ فردا کو صدا دے

سردار کی بیشتر نظموں میں جہاں حال کا آشوب ہوتا ہے وہیں اس کا رشتہ ماضی سے بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس انداز سے باتیں کرتے ہیں کہ وہ صرف حال ہی پر تبصرہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اس نظم کے یہ دو مصرعے دیکھئے ہونٹوں پہ وہی خشکی افلاس کے دھبے۔ چہروں پہ وہی بھوک کی ٹھہری ہوئی شامیں صرف ایک لفظ "وہی" کے استعمال سے افلاس اور بھوک کا رشتہ ماضی سے بھی قائم ہو جاتا ہے گویا یہ لفظ بھوک اور افلاس کے ایک طویل سلسلے کو ظاہر کرتا ہے۔ بھوک اور افلاس کی باتیں کرنے والا شاعر کس سے شکایت کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک اگر شاعری کی یہ تعریف ہے کہ انسانوں کے بنیادی مسائل کو بیان کیا جائے تو ہمیں اپنی تنقید کی معیار کو بھی ایک ایسا رخ دینے کی ضرورت ہے جو ایسی شاعری کے ساتھ انصاف کر سکے۔ اردو شاعری کا قافلہ مختلف پڑاؤ سے گزرا ہے۔ سردار جعفری کی شاعری کو بھی اس سفر کا ایک پڑاؤ تصور کرنا چاہئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ سردار نے ایک خواب دیکھا تھا اور یہ خواب ان کی زندگی کا سب سے اہم ترین واقعہ تھا اس کے بغیر جینا ان کے لئے زندگی کی موت تھی اس خواب کی ایک تصویر اس نظم میں دیکھئے:

پھر مرے خواب تصور کے جواں شہزادے
مستیٔ شوق کی گل رنگ قبائیں پہنے
بزم امروز میں پیمانہ بکف آئے ہیں
پوچھتے ہیں کوئی پیاسا تو نہیں محفل میں
کوئی بھوکا تو سر راہ نہیں سوتا ہے
موج مے کس نے چھپا رکھی ہے میخانوں میں
بجلیاں کس نے دبا رکھی ہیں پیمانوں میں
ساقی خاموش ہے اور پیر مغاں شرمندہ

اس نظم کی بنیادی فکر وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے مگر دیکھئے کہ شاعر خواب تصور کو جوان شہزادے کہتا ہے جو مستیٔ شوق کی گل رنگ قبائیں پہنے ہیں۔ کیا ان میں جمالیاتی عنصر کی کمی ہے۔ کوئی بھوکا تو سر راہ نہیں سوتا ہے ایسی باتوں سے گریز کرنا یا انہیں پسند نہیں کرنا ایک غیر ہمدردانہ رویہ ہے۔

سردار جعفری کی شاعری میں انسان دوستی اور محبت کے مضامین بکھرے پڑے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک شاعر اپنے تخلیقی سفر میں اس بات کا خیال رکھتا ہو کہ امن دوستی

www.taemeernews.com

خلوص و رواداری جیسی زندگی کی بنیادی قدروں سے اس کی شاعری دور نہ ہو۔ اردو شاعری میں اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سردار جعفری کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پچھلے بیس پچیس برسوں سے اپنے شعری سرمائے میں کچھ خاص اضافہ نہ کر سکے۔ اس لئے کہ جو خواب انہوں نے دیکھے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ مگر یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ وہ کون سے خواب تھے کیا انہیں دیکھنے سے ہم قاصر تھے۔ سردار کے خواب زندگی کی جن اعلیٰ قدروں سے وابستہ تھے وہ ہمارے ہی خواب تھے مگر ہم لوگوں نے انہیں صرف سردار کا خواب سمجھ لیا مگر یہ کیا کم ہے کہ سردار نے جیتے جی اپنی آنکھوں کو بے خواب نہیں ہونے دیا۔ اس زمین پر جب کبھی جہاں کہیں محبت، خلوص، امن، مساوات اور انسان دوستی کی فضا قائم ہوگی علی سردار جعفری بہت یاد آئیں گے۔ سردار ہی کی زبان میں:

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

□□□

اردو اکادمی کے ایک پروگرام میں بائیں سے: امیر قزلباش، حاجی انیس دہلوی، علی سردار جعفری، ساقی نارنگ اور منصور احمد عثمانی پیچھے ناز انصاری کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

منتخب کلام

علی سردار جعفری

صبح فردا

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجاکر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں، صبحِ فردا کا

(۲)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی، بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی، اک دولھن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی انگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بے قراروں کی
یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی
سحر کو آئے خورشیدِ درخشاں پاسباں بن کر
نگہبانی ہو شب کو آسماں کے چاند تاروں کی
زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی یورش سے
سپاہیں حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کی
خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی
کچل دیں اس کو فولادی قدم بھاری مشینوں کے
کرے یلغار اس پر ضرب کاری دستکاروں کی
اڑیں چنگاریوں کے پھول پتھر کے کلیجے سے
جھکے تیشوں کی محرابوں میں گردن کوہساروں کی
لبوں کی پیاس ڈھالے اپنے ساقی اپنے پیمانے
چمک اٹھیں مسرت سے نگاہیں سوگواروں کی
محبت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل مسیحا ہو
چمن میں آگ برسے شعلہ پیکر گل عذاروں کی
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

(۳)

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمینِ دل کے بانکے شہسواروں کی
یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور و دلّی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

www.taemeernews.com

گفتگو

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنگِ دشنام
طنز چھلکائے تو چھلکایا کرے زہر کے جام
تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خمدار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں
بے بسی حرف کو زنجیر بپا کر نہ سکے
کوئی قاتل ہو مگر قتلِ نوا کر نہ سکے

صبح تک ڈھل کے کوئی حرفِ وفا آئے گا
عشق آئے گا بصد لغزشِ پا آئے گا
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے، لب کانپیں گے
خامشی بوسۂ لب بن کے مہک جائے گی
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی
نفرت اٹھ جائے گی، مہمان مروت ہوگی

ہاتھ میں ہاتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے پیار کی سوغات لیے
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے
خوں کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح تک شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

نظم

بمبئی ہم پی رہے ہیں آج لے کر تیرا نام
لکھنؤ کی مے کے ساغر، بادۂ دہلی کے جام
صبح کی آنکھوں میں ہے صبحِ بنارس کا سرور
زلفِ شب میں خم بہ خم شامِ اودھ کا اہتمام
ہے ہوا میں وادیِ گنگا کی خوشبوئے بہار
ساحلِ موجِ عرب کو موجِ جمنا کا سلام
لے کے آئے ہیں مراٹھی کی زمیں کے واسطے
آسمانِ شوق سے اردو نوازوں کا پیام
مختلف ہوں سب کی طرزیں، مختلف ہوں سب کے رنگ
پھر بھی سارے ہم نوایانِ چمن ہوں ہم کلام

نومبر میرا گہوارہ

نومبر میرا گہوارہ ہے یہ میرا مہینہ ہے
اسی ماہِ منور میں
مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
مرے تارِ نفس میں جنبشِ بادِ صبا آئی
مشامِ روح میں
مٹی کی خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی
لہو نے گیت گایا
شمعِ ہستی جگمگا اٹھی
یہ لمحہ، لمحۂ میلادِ آدم تھا

www.taemeernews.com

اودھ کی خاکِ حسیں

گزرتی برسات، آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصور کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں
میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں۔
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دل نواز باہیں
وہ شاخِ صندل
کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لیے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے۔
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں۔
ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے۔

سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سُرخ گونیں مچل رہی ہیں
یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب بہتی جبیں کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

نیند

نیند ہے اک حسینہ
سُرمئی آنکھیں ہیں نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سایے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں سسکتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار، دکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بے زار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے
پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری
انگلیوں سے چھڑکتی ہے شبنم
اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

میرا سفر

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

www.taemeernews.com

خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب رعنائیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک مشت غبار انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

کون دشمن ہے

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ بندوقیں
کہاں سے لائے ہو، کس کی طرف ہے رُخ ان کا
دیارِ وارث و اقبال کا یہ تحفہ ہے؟
جگا کے جنگ کے طوفاں زمینِ نانک سے
اٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر

غلام تم بھی تھے کل تک، غلام ہم بھی تھے
نہا کے خون میں آئی تھی فصلِ آزادی

ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سنکی ہیں
ابھی شگوفوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی
ابھی بہار کے لب پر ہنسی نہیں آئی
نہ جانے کتنے ستارے بجھی سی آنکھوں کے
نہ جانے کتنے فسردہ ہتھیلیوں کے گلاب
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا

مزا تو جب تھا کہ مل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور
یہ بہکے بہکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب؟
کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟

www.taemeernews.com

سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحدِ دل و جاں ہے ، ہمارا جسم ہے وہ
حسیں ، بلند ، مقدس ، جوان، پاکیزہ
ہے اس کا نام خیابانِ جنتِ کشمیر
ہے اس کا نام گلستانِ دلّی و پنجاب
ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنؤ بھی کبھی

تم اس کو تیغ کے ہونٹوں سے چھو نہیں سکتے
ادب سے آؤ کہ غالبؔ کی سرزمین ہے یہ
ادب سے آؤ کہ ہے میر کا مزار یہاں
نظام و کاکی و چشتی کے آستانے ہیں
جھکاؤ تیغوں کے سر بارگاہِ رحمت میں

ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے
تمھارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے
اگرچہ کہنے کو جی چاہتا نہیں لیکن
جوابِ اہلِ ہوس ، تیغِ آب دار بھی ہے

اُدھر بہن ہے کوئی ، کوئی بھائی ، کوئی عزیز
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار کوئی
رفیقِ محبس و زنداں ، رفیقِ دار کوئی
ہماری طرح سے رسوائے کوئے یار کوئی
لبوں پہ جن کے تبسم ہے عہدِ رفتہ کا
نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے
دلوں میں نور چراغِ امیدِ فردا کے

وہ سب جو غیر نظر آرہے ہیں، اپنے ہیں

ادھر بھی حلقۂ یاراں ، ہجومِ مشتاقاں
ادھر بھی چاہنے والوں کی کچھ کمی ہی نہیں
ہزاروں سال کی تاریخ ہے ثبوت اس کا
کھڑے ہیں سینے پہ زخموں کے گل کھلائے ہوئے
دیارِ ہیر کی یادوں سے دل جلائے ہوئے
چناب و جہلم و راوی سے لو لگائے ہوئے

ہمارے بیچ میں حائل ہیں آگ کے دریا
تمھارے اور ہمارے لہو کے ساگر ہیں
بہت بلند یہ نفرتوں کی دیواریں
ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں
تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں
تمھیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں
مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا
لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا
پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اُس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

www.taemeernews.com

غزلیں

علی سردار جعفری

○

کس سے پوچھیں، کون بتائے، صبح کی کب پھوٹے گی کرن
رات کی سرحد مقتل مقتل، باندھ کے نکلو سر سے کفن
لے کر پھر قندیلِ محبت، اترو دل کے اندھیرے میں
روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن
جشنِ ستم ہے، ناچ رہے ہیں خنجر، تیغیں گاتی ہیں
خون آلودہ شامِ گیسو، زخم رسیدہ صبحِ بدن
کعبۂ دل میں بیٹھے ہیں، اب بھی صدیوں کے فرسودہ بُت
رنگ و نسل و شیخ و برہمن، مذہب و ملت، ملک و وطن
یہ دنیا گمراہ ہے اب تک، پھر بولو اے سنتِ کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی مٹی کے برتن
ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں، ایک ہی رس سب میووں میں
اپنے منہ کو میٹھا کرلو، کرلو آنکھوں کو روشن
ایک پرستاں کی سب پریاں، ایک گلستاں کے سب پھول
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیراہن
خون کی نہریں کھینچ رہی ہیں انسانی لاشوں کے کھیت
بھوکے پیٹ کے کام نہ آئیں گے یہ زخموں کے خرمن
ہم نے تو روٹی کی خاطر تن کے ٹکڑے بیچے ہیں
تم نے آخر کس کی خاطر بیچ دیا ہے اپنا من

○

چشمِ بدمست کو پھر شیوۂ دلداری دے
دلِ آوارہ کو پیغامِ گرفتاری دے
عشق ہے سادہ و معصوم اسے اپنی طرح
جوہرِ تیغِ ادا، خنجرِ عیاری دے
جو دُکھے دل ہیں انھیں دولتِ درماں ہو عطا
درد کے ہاتھ میں مت کاسۂ ناداری دے
کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا
سرکشی دل کو نیا ذوقِ گنہگاری دے
شاخِ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے گل
دیکھیں کب بادِ صبا حکمِ چمن کاری دے
اے مرے شعلۂ دل، شعلۂ شعر و دانش
رات آخر ہے اسے جشنِ شرر باری دے
چمن افسردہ ہے اے جانِ چمن روحِ بہار
گل کو بھی اپنے تبسم کی فسوں کاری دے

www.taemeernews.com

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا...

تعزیتی پیغامات

جناب کے۔ آر۔ نارائنن (صدر جمہوریہ)

مجھے علی سردار جعفری کی موت سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ جو اپنی تحریروں میں ایک انقلابی تھے اور عام آدمی کے کاز کے لیے لکھتے تھے اور عام انسانوں کی نبض بھی پہچانتے تھے۔ اپنے کاموں کی وجہ سے وہ اپنے بے شمار مداحوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جناب کرشن کانت (نائب صدر جمہوریہ)

سردار جعفری کی موت سے مجھے گہرا صدمہ ہوا ہے۔ سردار جعفری ترقی پسند دانشوروں کی اگلی صف میں تھے۔ ان کی ذہانت، اردو ادب سے ان کی گہری وابستگی اور محنت کش عوام سے ان کی محبت نے ہندوستانیوں کی کئی نسلوں کے ذہن کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جناب اٹل بہاری باجپئی (وزیر اعظم)

مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کے انتقال پر گہرے غم کا اظہار کرتے ہوئے وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے کہا کہ سردار جعفری کو ہمیشہ ایک انقلابی دانشور اور خطیب کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا کہ جعفری صاحب نے اپنی دانشورانہ صلاحیتوں کا سامراجیت ظلم اور طبقاتی نابرابری کے خلاف استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جدوجہد آزادی میں شمولیت کے وقت انھوں نے مجاہد آزادی کے طور پر شہرت پائی اور کئی مواقع پر انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ مگر اس سے ان کے حوصلوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ تعزیتی پیغام میں مرحوم شاعر کے پانچوں شعری مجموعوں اور سوانحی مضامین کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندوستانی ادب میں ان تخلیقات کی جگہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ سردار جعفری سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور پچھلے سال میں ان کی نظموں کی ایک کتاب لے کر لاہور گیا تھا۔

جناب اندر کمار گجرال (سابق وزیر اعظم)

علی سردار جعفری کا انتقال علمی دنیا کے لیے ایک سانحہ ہے۔ سردار نے عمر بھر ادب کی خدمت جس جاں فشانی سے کی اس کی دوسری مثالیں کم ملتی ہیں۔ اردو ادب کو ایک نئی وسعت اور سماجی گہرائی دینے میں سردار کی تمام شخصیت ابھر کر آجاتی ہے۔ ادب کے علاوہ سردار جعفری جنگ آزادی کے مجاہدوں میں بھی صف اول میں کھڑے تھے اور اس ناطے سے ان کو کئی مرتبہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بھی رہنا پڑا۔ سردار سے میری دوستی طالب علمی کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اس وقت بھی ان کی شخصیت اپنے ہم نواؤں کو متاثر کن تھی۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو کامیاب بنانے میں سردار کا اہم کردار رہا ہے اور اگر آج اردو کے ترقی پسند مصنفین کی تحریروں کی دنیا بھر میں تعریف ہے تو اس کے لیے سردار ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ مجھے آج دکھ کے ساتھ اپنے عمر بھر کے ایک دوست کی جدائی کا احساس ہو رہا ہے۔ برسوں پہلے جب سردار نے اقبال صدی منانے کی بات کی تھی اور مجھے اس کمیٹی کی صدارت کے لیے کہا تھا تو میں نے اسے خوشی سے قبول کیا تھا کیوں کہ سردار جعفری نے مجھے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ کمیٹی اقبال کی شاعری کو بطور ایشیائی بیداری کے دیکھے گی اور سردار خود اس کے سکریٹری تھے۔ اس کمیٹی کے صدر کے

www.taemeernews.com

نا طے ایک مرتبہ پھر سے مجھے سردار کا بہت قرب ملا۔ سلطانہ کے ساتھ ہماری دوستی اس سے بھی پرانی تھی اور خاص طور پر ہم دونوں یعنی میں اور میری بیوی ان چند دنوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں جب سردار جعفری سلطانہ اور عصمت چغتائی ماسکو میں ہمارے پاس ٹھہرے تھے اور پھر ہم سب مل کر تاشقند اور دوشنبہ (تاجکستان) گئے تھے۔ ان کے قریب رہنے سے سردار کی دانشورانہ اڑان اور انسان دوستی کا نقش آج بھی ہمارے دلوں پر ہے۔ آج سلطانہ کے ساتھ اس دکھ درد میں ہم شریک ہیں لیکن یہ افسوس برقرار رہے گا کہ سردار کی وفات نے جو خلا چھوڑا ہے وہ ادیبوں اور ادب دوستوں کو ہمیشہ محسوس ہوتا رہے گا۔

جناب ارون جیٹلی (مرکزی وزیر اطلاعات)

معروف اردو شاعر اور گیان پیٹھ ایوارڈ سے سرفراز علی سردار جعفری اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے مشعل بردار تھے۔ جناب جعفری نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ جس طرح سے دبے کچلے طبقہ کے لوگوں کے مسائل اور زندگی کی سچائیوں کو ابھارا ہے اس کے لیے انھیں برسوں یاد رکھا جائے گا۔

محترمہ شیلا دکشت (وزیر اعلیٰ، دھلی)

علی سردار جعفری کے انتقال سے ملک کے ادبی دنیا میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ہم سب اس نیک اور سچے انسان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ علی سردار جعفری کو خدا اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر و تحمل عطا فرمائے۔

جناب یونس سلیم (سابق گورنر بہار)

اردو زبان و ادب کے جن ادیبوں اور شاعروں سے اردو کی آبرو برقرار ہے وہ رفتہ رفتہ اٹھتے جا رہے ہیں۔ علی سردار جعفری کی قد آور شخصیت اردو ادب میں بے مثال تھی۔ ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کا جتنا زبردست نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کے امکانات مستقبل قریب میں نظر نہیں آتے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ معیار کے ترقی پسند شاعر تھے بلکہ نثر نگاری میں بھی اپنا منفرد اسلوب رکھتے تھے اور انھوں نے تنقید و تحقیق پر جتنا کام کیا ہے اور جو سرمایہ انھوں نے اردو زبان کے لیے چھوڑا ہے زبان و ادب کی تاریخ میں ان کا نام ایک درخشاں ستارے کی طرح روشن رہے گا۔ علی سردار جعفری کے انتقال کو میں اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا ہوں اس لیے کہ ۵۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے میرے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

جناب امر سنگھ (جنرل سکریٹری سماجوادی پارٹی)

ہمیں ناز ہے علی سردار جیسی شخصیتوں پر جو صحیح معنوں میں انسانیت کے پیکر تھے۔ جن کی شخصیت کسی ذات یا مذہب کے دائرے میں نہیں بندھی تھی۔ انھیں ہر ہندوستانی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا تھا، وہ سیکولر تھے۔ جنگ آزادی میں ان کا اہم کردار رہا۔ وہ جیل گئے۔ آج ہم جس آزاد ہندوستان میں سانسیں لے رہے ہیں یہ ان کی دین ہے اور زندگی تک ہماری سانسیں ان کی قرض دار رہیں گی۔ میں ان کی وفات پر گہرے دکھ کے ساتھ انھیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

جناب راج ببّر (ممبر پارلیمنٹ)

علی سردار جعفری صاحب کا انتقال میرے لیے ذاتی صدمہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ نادرہ (میری اہلیہ) کی جعفری صاحب سے ذہنی وابستگی اور مرحوم سجاد ظہیر صاحب سے دیرینہ تعلق کی وجہ سے وہ ہمارے گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کا کلام ہمارے لیے مشعل راہ ہوتا تھا۔ گو کہ فلم انڈسٹری سے ان کی زیادہ وابستگی نہیں تھی مگر ممبئی میں ہی رہتے تھے اس لیے اکثر و بیشتر ملاقات کا موقع بھی رہتا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر میرے لیے انتہائی افسوس ناک ہے۔ جعفری صاحب کے انتقال سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکے گا۔

جناب کیفی اعظمی

علی سردار کے انتقال کی خبر سن کر ایسا لگا جیسے تاج محل گر گیا ہے۔ علی سردار جعفری میرے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ گزشتہ ماہ ممبئی میں (اسپتال میں) ان سے آخری ملاقات ہوئی اس وقت وہ بول نہیں پا رہے تھے صرف اشاروں

www.taemeernews.com

میں بات ہوئی۔ کل صبح جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو ایسا لگا کہ جیسے میرا سب کچھ چلا گیا۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کا بہت بڑا نقصان تو ہوا ہی ساتھ ہی سیکولرزم کو بھی دھچکا لگا ہے۔ کیفی نے کہا کہ علی سردار جعفری دنیا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ پاک و ہند تنازعہ سے انھیں بڑی تکلیف تھی، جس کو اکثر انھوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ ان کے جانے سے میں تنہا ہو گیا ہوں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

افسوس! جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

علی سردار جعفری ترقی پسندوں کے سب سے بڑے قافلہ سالار تھے۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور فیض احمد فیض کی صحبتوں کا فیض اٹھاتے ہوئے انھوں نے ترقی پسند ادب پر اپنی نہایت عمدہ کتاب لکھنے کے بعد ترقی پسندی کی نظریاتی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ شاعری، خطابت اور نثر تینوں کے وہ بادشاہ تھے۔ اسی لیے فعال شخصیت کا اثر بھی زیادہ ہوتا تھا۔ ان کی شاعری کے امتیازی عناصر انسان دوستی، انسان سے محبت، عوام کے دکھ درد کی ترجمانی، امن اور آشتی ہیں اور جن موضوعات کو انھوں نے جیسا نبھایا انھیں کا حصہ تھا یعنی:

وفاداری بشرط استوار اصل ایماں ہے

وہ ایک البیلے شاعر تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص طرح کی دلنوازی اور کشش تھی جو ان کی مقبولیت کی ضامن تھی۔

جناب مظہر امام

سردار جعفری کی وفات اردو ادب ہی کا نہیں، بلکہ پورے ہندوستانی ادب کا ایسا نقصان ہے کہ اس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ سردار جعفری کی شخصیت اور شاعری نے عالمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی بڑی زبان ہو جس میں سردار جعفری کے کلام کا ترجمہ نہ ہوا ہو، اور دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں انھیں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے نہ جانا جاتا ہو۔

جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے، سردار جعفری کا مرتبہ ایک شاعر یا ادیب سے کہیں زیادہ ہے۔ یعنی انھیں نظر میں رکھے بغیر اس زمانے کے ادبی مزاج، ادبی رویے اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ فیض کے انتقال کے بعد وہ برصغیر کے سب سے بڑے شاعر تھے اور جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے بعد کی نسل میں جو ممتاز شاعر ہوئے، یعنی مجاز، جذبی، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، ساحر، مجروح، کیفی اعظمی، سردار جعفری اسی کہکشاں کا ایک بے حد چمکتا ستارہ تھے۔

● بزرگ نقاد اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے مرحوم علی سردار جعفری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ سردار جعفری کے انتقال سے دنیائے ادب میں ایک خلا محسوس ہونے لگا ہے۔

● ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ مرحوم ہمارے عہد کے اردو کے سب سے بڑے شاعر تھے اور ترقی پسند تحریک کے فروغ میں انھوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے عہد میں ان سے بڑھ کر ادبی موضوعات پر تقریر کرنے والا اور کوئی نہیں تھا اور آئندہ بھی اس کی امید کم ہے۔

● ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ اس وقت صرف برصغیر میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا اور آخری نام سردار جعفری تھا۔

● جامعہ اردو علی گڑھ کے رجسٹرار سید انور سعید نے مشہور ترقی پسند شاعر سردار جعفری کے انتقال پر اپنے دفتر میں منعقد ایک تعزیتی میٹنگ میں کہا کہ علی سردار جعفری کے انتقال کے ساتھ سچ مچ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اردو شاعری کی ترقی پسند دھارا کے وہ ایک انتہائی اہم شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اقدار کے شاید سب سے زیادہ جانے مانے تجزیہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے اردو ادب کی مشکل اور چیلنج بھری دنیا کو چمکدار بنانے کا راستہ اپنایا۔ انھوں نے کہا کہ علی سردار جعفری ترقی پسند اردو تحریک کی ایک ایسی شخصیت رہے ہیں جن کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ وہ ترقی پسند

www.taemeernews.com

تحریک کے بانیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی نظموں کو ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔

● جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے ایک پریس بیان میں کہا علی سردار جعفری کا انتقال اردو دنیا کا نقصان عظیم ہے۔ اردو نے ایک عملی ادیب و شاعر کھو دیا۔ امن کا پیغامبر رخصت ہو گیا۔ مرحوم جعفری نے اردو زبان و ادب کی ترویج، اشاعت میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے دبے کچلے افراد کی آواز کو عام کرنے کا کام کیا، ان کی شاعری امن و آشتی کا پیغام تھی۔ جامعہ سے ان کی مخصوص قربت تھی۔ ان کی موت کی خبر سے مجھے اور ان کے تمام مداحوں کو گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ جامعہ برادری مرحوم کے پسماندگان اور ان کے متعلقین کے غم میں برابر کی شریک ہے۔

● پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسبیر سنگھ اہلووالیہ نے گیان پیٹھ ایوارڈی علی سردار جعفری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ قلم کار مرنے اور مٹنے سے ہمیشہ بالاتر ہوتے ہیں جو سماج کے مظلوم اور مفلوک الحال عوام کی آواز میں آواز ملا کر نئے شعور کو بیدار کرتے ہیں۔ ڈین اکیڈمک پروفیسر کلدیپ سنگھ دیر نے کہا کہ جس شاعر نے "نئی دنیا کو سلام" جیسا مجموعہ کلام دیا ہو اسے سلام آخر پیش کرنا ہر تعلیمی اور فکری ادارے کا فرض ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر ناشر نقوی نے سردار جعفری کی نظم "میرا سفر" پڑھ کر سنائی۔ ہاتھوں کے کمل کمہلائیں گے / اور برگ زباں سے نطق و صدا کی ہر تتلی اڑ جائے گی / پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا / سردار کہاں ہے محفل میں۔

● میڈیا فورم آف انڈیا نے علی سردار جعفری کو صدی کی ایک ممتاز شخصیت قرار دیا اور کہا کہ ان کی انسانیت نوازی، شرافت، متانت، تواضع اور انکساری اور علم دوستی نے ان کو ایک مثالی شخصیت بنا دیا تھا۔ انھوں نے اپنی لگن اور محنت سے بلند ترین مقام حاصل کیا جو نسل انسانی کے لیے قابل تقلید ہے۔

اردو اکادمی، دہلی

سکریٹری اردو اکادمی جناب منصور احمد عثمانی نے کہا "اردو کے مشہور و معروف شاعر، ادیب اور مفکر جناب علی سردار جعفری ۸۷ سال کی مجاہدانہ زندگی گزار کر اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات اردو دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ علی سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لیتی تھیں وہ ایک شاعر، آتش نوا، ایک بے بدل خطیب، ایک صاحب نظر نقاد، ایک ذی فہم ادیب، اپنی پارٹی کے ایک سرگرم اور وفادار رکن، اشتراکیت کے شیدائی، ایک پرامن انقلابی اور انسان دوستی کے حامی تھے۔ غرضیکہ ان کا ذہن کئی جہتوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان کی کثیر الجہات شخصیت کی وجہ سے ان کے چاہنے والے ان گنت تعداد میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جس طرح فیض احمد فیض کی مقبولیت میں "زندانی زندگی" کا بڑا ہاتھ رہا ہے، اسی طرح علی سردار جعفری کی متاع لوح و قلم نے بھی قید و بند کی صعوبتوں میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ لکھنؤ، بنارس، بمبئی اور ناسک کی جیلوں کے در و دیوار ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کے شاہد ہیں۔ سردار جعفری کی مقبولیت کا سبب ان کی وہ فنکارانہ صلاحیتیں بھی ہیں جو فلم اور ٹی وی کے میدان میں نظر آئیں۔ انسان دوستی کا پیغام اور لہو کی محافظت کا احساس ان کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں جو آہنگ، ترنم، غنائیت اور موسیقی ہے اس نے آزاد نظم کو اردو میں مقبول بنانے میں کافی مدد کی ہے۔ آج ہم اس نیک دل اور سچی زندگی جینے والے انسان کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جسے دنیا علی سردار جعفری کے نام سے جانتی ہے۔ دعا ہے کہ علی سردار جعفری کو خدا اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو خاص طور سے ان کی شریک حیات کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جو بادہ کش ہیں پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

قومی اردو کونسل

قومی اردو کونسل نے ایک قرار داد میں کہا ہے کہ علی سردار جعفری ادب کی ترقی پسند تحریک کے اہم ترین ستون

www.taemeernews.com

سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے وہ اس سے وابستہ رہے۔ ان کی شاعری اور ان کی نثری نگارشات دونوں اس تحریک کے مختلف ادوار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جعفری صاحب نظم کے شاعر تھے اور ان کی نظموں نے ہم عصر اردو شاعری کو موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر متاثر کیا۔ ایک بڑے نظم نگار کی حیثیت سے وہ اردو کی ادبی تاریخ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ علی سردار جعفری کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں کچھ مدت پہلے انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی اعزاز "گیان پیٹھ ایوارڈ" پیش کیا گیا تھا۔ قومی اردو کونسل علی سردار جعفری کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے۔ ان کی وفات سے اردو کے شعری اور ادبی منظر نامے میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پر ہوتا نظر نہیں آتا لیکن ان کی شاعری ہمیشہ ہمارے درمیان زندہ رہے گی۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا، جس میں کہا گیا کہ "علی سردار جعفری ایک صاحب علم شاعر تھے، ان کی شاعری میں روایت کا شعور بھی ہے۔ حال کا آشوب بھی اور مستقبل کا ایک خواب بھی۔ غیر ترقی پسندانہ رویے کے خلاف سردار کی ادبی جدوجہد کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سردار جعفری ترقی پسند اقدار کے امین اور علامت تھے ان کی شاعری میں جو ترقی پسندی ہے اس کا رشتہ کلاسیکی شاعری کی ترقی پسندی سے قائم ہو جاتا ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سردار ہمیشہ اردو کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہے۔ آج جو اردو کی صورتِ حال میں کوئی بہتری ہے تو اس میں نمایاں حصہ علی سردار جعفری کی کوششوں کا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند

اردو گھر میں ممتاز ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری کے لیے ایک تعزیتی جلسہ میں شرکاء نے اس عہد کے ایک اہم اردو شاعر علی سردار جعفری کی حیات، شاعری، خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ وہاں کہا گیا ہے کہ علی سردار جعفری نے فرد کی آزادی، امن عالم، مساوات اور منصفانہ نظام کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی۔ ترقی پسند تحریک کے فروغ میں جعفری صاحب نے کلیدی رول نبھایا۔ آج ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آل انڈیا تعلیمی و ملی فاؤنڈیشن

فاؤنڈیشن کے صدر دفتر ذاکر نگر اوکھلا میں ایک تعزیتی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں فاؤنڈیشن کے تمام ارکان کے ساتھ ساتھ علاقہ کے معزز اور ادب شناس لوگوں نے بھی شرکت کی۔ ان کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ زندگی بھر دوستی کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کام کرتے رہے۔

بزم ہم قلم

بزم کے ایک تعزیتی جلسے میں مقررین نے سردار جعفری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سردار جعفری کا اٹھ جانا بہت بڑا نقصان ہے۔ ان کی فنی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن ان کی تنقید نگاری، نثر نگاری، تقریر کرنے کی صلاحیت اور ایک دانشور کی حیثیت سے ان کی شخصیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ علی سردار جعفری کسی ایک تہذیب یا تحریک کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل دبستان کا نام ہے۔ علی سردار جعفری اردو ادب کا روشن ستارہ ہیں، جس کی روشنی سے کئی نسلوں نے استفادہ کیا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ

اردو کے عظیم شاعر علی سردار جعفری کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کی طرف سے بھی دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری بدر الدین احمد نے اظہارِ تعزیت میں کہا کہ ان کی شاعری اس لیے بھی خصوصیت کی حامل ہے کہ انھوں نے سماج کے دبے ہوئے لوگوں کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی۔ مسٹر احمد نے اپنے والد مرحوم فخر الدین علی احمد کے حوالے سے کہا کہ مرحوم نہ صرف ان کے علم و فن کے معترف تھے بلکہ وہ ان کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ شاہد ماہلی نے سردار جعفری کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا

www.taemeernews.com

کہ ان کے انتقال سے نہ صرف ترقی پسند تحریک کے ایک اہم ستون کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اپنے کلام کے ذریعہ فرد کی آزادی، امن عالم، مساوات اور منصفانہ نظام کے لیے آواز بلند کرنے والی شخصیت بھی ہمارے بیچ سے اٹھ گئی۔

راجستھان اردو اکادمی

راجستھان اردو اکادمی کے دفتر میں علی سردار جعفری کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ مقررین نے علی سردار جعفری کو اردو ادب کا ایک ایسا ادیب بتایا جس نے اپنی تحریکوں سے سماج میں ہونے والے انتشار کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ جعفری صاحب ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی کے بھی علم بردار تھے۔ جعفری صاحب آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تنہا ادیب تھے جنھوں نے قوموں کے ٹکراؤ کو ختم کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اکادمی کے سکریٹری معظم علی نے کہا کہ جعفری صاحب کا اہم کارنامہ اردو ادب میں دوسری زبانوں کے ترجمے کے ساتھ شروع ہوتا ہے اگر جعفری صاحب ان ترجموں کو ہم تک نہیں پہنچاتے تو دوسرے ممالک کے ادب سے ہم قطعی روشناس نہ ہوتے۔ ابھی حال ہی میں جعفری صاحب کی کتاب "غالب کا سومناتی خیال" منظر عام پر آئی ہے، جس میں جعفری صاحب نے جہاں غالب نے دستمبو کو چھوڑا وہاں سے شروع کیا ہے اور غالب کے بنارس کے سفر کو ایک نئے زاویے کے ساتھ قاری تک پہنچایا۔

غالب اکیڈمی

اردو کے ترقی پسند شاعر و ادیب علی سردار جعفری کے انتقال پر ملال پر غالب اکیڈمی میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ مختلف لوگوں نے علی سردار جعفری کے فن اور شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی اور کہا کہ جعفری صاحب کا غالب اور اقبال سے خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے کلام غالب کو اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے غالب اردو کے علاوہ ہندی والوں میں بھی مقبول ہوئے۔ انھوں نے عملی طور پر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مظلوموں کی ہمدردی کی، امن و آشتی کا پیغام دیا، انسانیت کا درس دیا۔ اس وقت ہمارے سماج اور اردو کو جعفری صاحب کی سخت ضرورت تھی ایسے وقت میں ان کا چلا جانا اردو دنیا کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

اردو کے بلند پایہ ادیب، شاعر اور دانشور سردار جعفری کی رحلت پر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر عتیق اللہ نے سردار جعفری کو ایک گراں قدر شاعر اور دانشور قرار دیتے ہوئے ان کی متحرک اور فعال شخصیت کے متنوع پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ سردار جعفری اردو تہذیبی تاریخ کا ایک اہم باب تھے۔ وہ اُن باقیات الصالحات میں سے تھے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کو ایک خاص سمت عطا کی اور اسے بام عروج پر پہنچایا۔ وہ مظلوموں، مجبوروں اور نکبت کے ماروں کے حق میں فاشست قوتوں کے خلاف تا بہ آخر برسر جنگ رہے۔ پروفیسر عبدالحق نے سردار جعفری کے علمی کارناموں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے لسانیات شعری جیسے کام پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ ایک انتہائی دقت طلب اور تحقیق طلب کام تھا، جس سے سردار جعفری جیسی علمی شخصیت ہی عہدہ برآ ہو سکتی تھی۔ سردار جعفری ایک غالی ترقی پسند ہونے کے باوجود اردو اور فارسی کے کلاسکس اور کلاسیکی رموزِ فکر و فن سے کماحقہ آگاہ تھے۔ اسی آگہی کے ذریعہ انھوں نے لسانیاتِ شعری سے متعلق الفاظ کے تہذیبی تناظرات اور سرچشموں تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ یہ سعی اسی لیے کامیاب ہے کہ اسے سردار جعفری جیسے صاحبِ علم نے انجام دیا تھا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے سردار جعفری کو مردِ مجاہد کے نام سے یاد کیا، جو وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے کہ مصداق، ترقی پسند تحریک سے ابتدا تا آخر وابستہ رہے اور اسے اعتبار کے درجے تک پہنچایا۔ سردار جعفری زندگی بھر ظلمت پرستوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اب ہمارا عہد بڑی تیزی

www.taemeernews.com

کے ساتھ ان مایہ ناز ہستیوں سے محروم ہوتا جارہا ہے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ڈاکٹر ابن کنول نے سردار جعفری کی رحلت کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ٹھہرایا۔ سردار جعفری نے ایک بحث کی صورت اختیار کرلی تھی۔ نئی دنیا کو سلام، پتھر کی دیوار، نیند اور خاک اودھ کے نام جیسی نظموں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ان اسلوب کو منفرد ترین قرار دیا۔

جناب سبرت رائے سہارا (سہارا شری)

جناب علی سردار جعفری صاحب کی وفات نہ صرف اردو ادب کا بہت بڑا نقصان ہے بلکہ ایک بڑی ہندوستانی شخصیت سے آج ہم محروم ہوگئے ہیں، جنھوں نے ہندوستان بھر میں ہی نہیں دنیا کے متعدد ممالک میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ وہ آج ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی شاعری ہمارے درمیان ہمیشہ رہے گی جو ہمیں ان کی یاد بھی دلاتی رہے گی اور ہماری رہنمائی بھی کرتی رہے گی۔ میں یہاں ان کی مشہور نظم کے تین مصرعوں کے ساتھ ہی انھیں اپنی جانب سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں:

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

□□□

□□□

ایک یادگاری تصویر میں دائیں سے: خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، ایک نوجوان، علی سردار جعفری اور راجندر سنگھ بیدی

www.taemeernews.com

اردو اکادمی کی جانب سے پاکستانی شعرا کو استقبالیہ دیا گیا۔ تصویر میں دائیں سے: محترمہ صدیقہ شبنم، سلیم کوثر، علی سردار جعفری، خلیق انجم، حسن رضوی، جمیل الدین عالی، عاشور کاظمی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔

زیر نظر تصویر میں بائیں سے: جناب رحمن نیر (مدیر بیسویں صدی)، جناب علی سردار جعفری، جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ، جناب مودود صدیقی، جناب منور امروہوی اور جناب انور دہلوی کو دیکھا جا سکتا ہے

www.taemeernews.com

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام علی سردار جعفری کا ایک خط

بشکریہ: آرکائیوز، انجمن ترقی اردو ہند

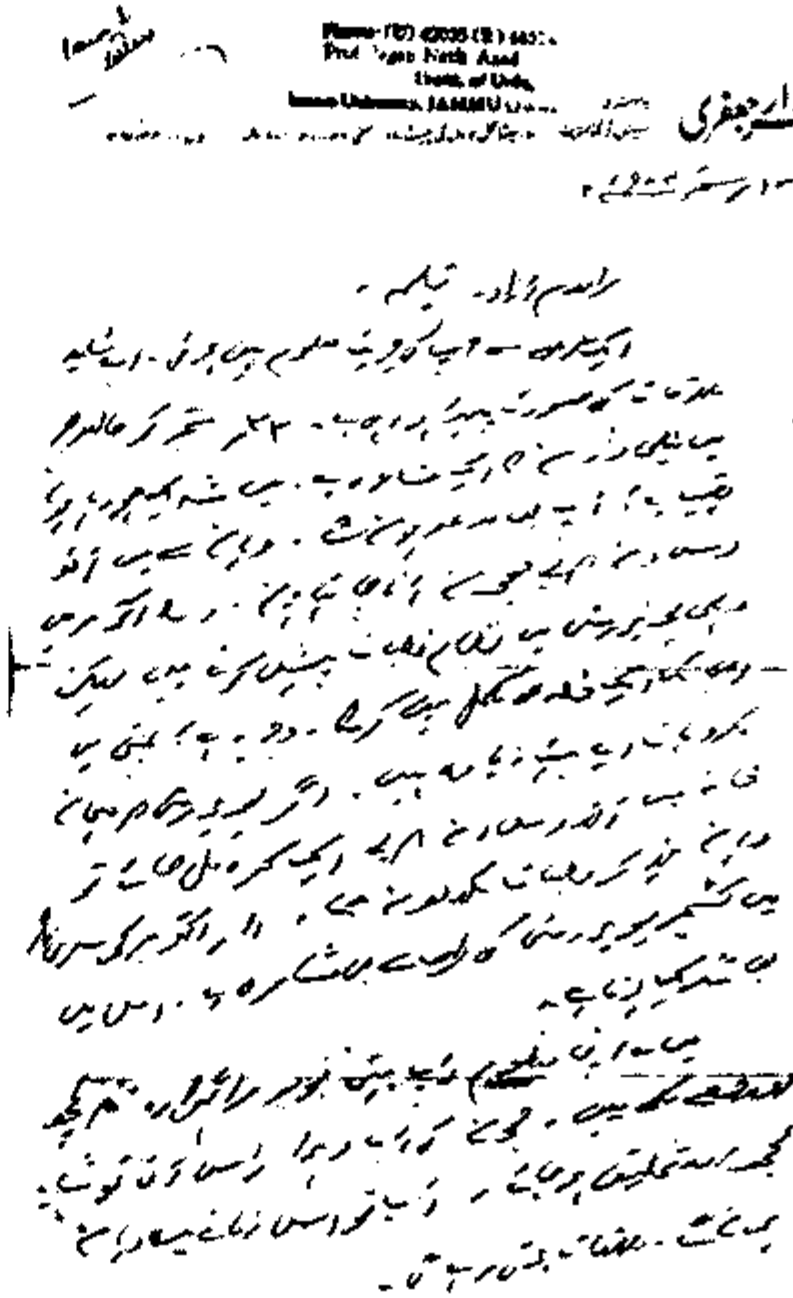

ڈاکٹر خلیق انجم کے نام علی سردار جعفری کا ایک خط

بشکریہ: آرکائیوز، انجمن ترقی اردو ہند

www.taemeernews.com

علمی، ادبی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں

تصانیف : (شاعری) پرواز، خون کی لکیر، نئی دنیا کو سلام، امن کا ستارہ، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور، پیار امن شرر، لہو پکارتا ہے۔

: (نثر) ترقی پسند ادب، لکھنؤ کی پانچ راتیں، پیغمبرانِ سخن، اقبال شناسی، غالب اور اس کی شاعری (انگریزی بہ اشتراک قرۃ العین حیدر) ترقی پسند تحریک کی نصف صدی (نظام اردو خطبات، دہلی یونیورسٹی)

: (مضامین) ادب، ثقافت اور سیاست پر اردو اور انگریزی میں ۳۰۰ سے زائد مضامین

تدوین و ترتیب : دیوانِ غالب، دیوانِ میر، کبیر بانی، پریم وانی

تراجم : منتخبہ نظموں کا روسی، اُزبک اور فارسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض نظمیں انگریزی، فرانسیسی، عربی اور متعدد ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ ایک طویل نظم 'امن کا ستارہ' بارہ ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ایک طویل ڈرامائی نظم 'نئی دنیا کو سلام' کو چودہ زبانوں میں ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے جس میں سے کئی زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

اعزازات : سویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۹۵ء، پدم شری ۱۹۶۷ء، جواہر لال نہرو فیلوشپ ۱۹۶۹ء، سجاد ظہیر ایوارڈ، لکھنؤ ۱۹۷۴ء، اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۷ء، اقبال میڈل (پاکستان) ۱۹۷۸ء، اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء، مخدوم ایوارڈ، اردو اکیڈمی حیدر آباد ۱۹۸۰ء، میر تقی میر ایوارڈ، اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۲ء، کمارن آسن ایوارڈ (ملیالم) ۱۹۸۳ء، ہندروس دوستی میڈل ۱۹۸۴ء، ڈی لٹ (اعزازی سند) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۶ء، اقبال اعزاز، حکومت مدھیہ پردیش ۱۹۸۶ء، فیض احمد فیض ایوارڈ، عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی ۱۹۸۷ء اور گیان پیٹھ ایوارڈ ۱۹۹۸ء۔

صحافت : مدیر "نیا ادب"، رکن مجلس ادارت "قومی جنگ"، مدیر "گفتگو"، مدیر "ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی، مہمان مدیر "کتاب نما"، نئی دہلی

ڈاکومینٹری فلمیں : پھر بولو اے سنت کبیر (کہانی اور مکالمے)، ڈاکٹر محمد اقبال (کہانی اور مکالمے)، ہندوستان ہمارا (کہانی اور مکالمے)، جدوجہد آزادی کے سو سال (انگریزی)

ٹی۔ وی : پروڈیوسر "محفلِ یاراں"، آج کل (۱۷ اپی سوڈ پر مشتمل ایک ٹی۔ وی سیریل "کہکشاں" جن میں مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین اور اسرار الحق مجاز پر اپی سوڈ شامل تھے۔

رکنیت : رکن سینٹ، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی، وزیٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی، جموں، جنرل سکریٹری آل انڈیا اقبال صدی کمیٹی، صدر انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) رکن نیشنل بک ٹرسٹ، اعزازی پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو اور ٹی۔ وی، صدر فلم رائٹرز ایسوسی ایشن، بمبئی، ڈائرکٹر مہاراشٹر اردو اکیڈمی، اردو کے فروغ کے لیے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بروئے عمل لانے کے لیے مرکزی حکومت نے جو کمیٹی بنائی، اس کے صدر تھے۔

□□□

www.taemeernews.com

AIWAN-E-URDU, DELHI Issue No. 161 September 2000 Price Rs.7.00 A.H.W.
Registered with the Registrar of News Papers at R.N. No. 45938/87 Regd. No.11227/2000
Due Date of Posting 25th and 26th August 2000 Office of Posting P.S.O. & I.P.H.O. New Delhi

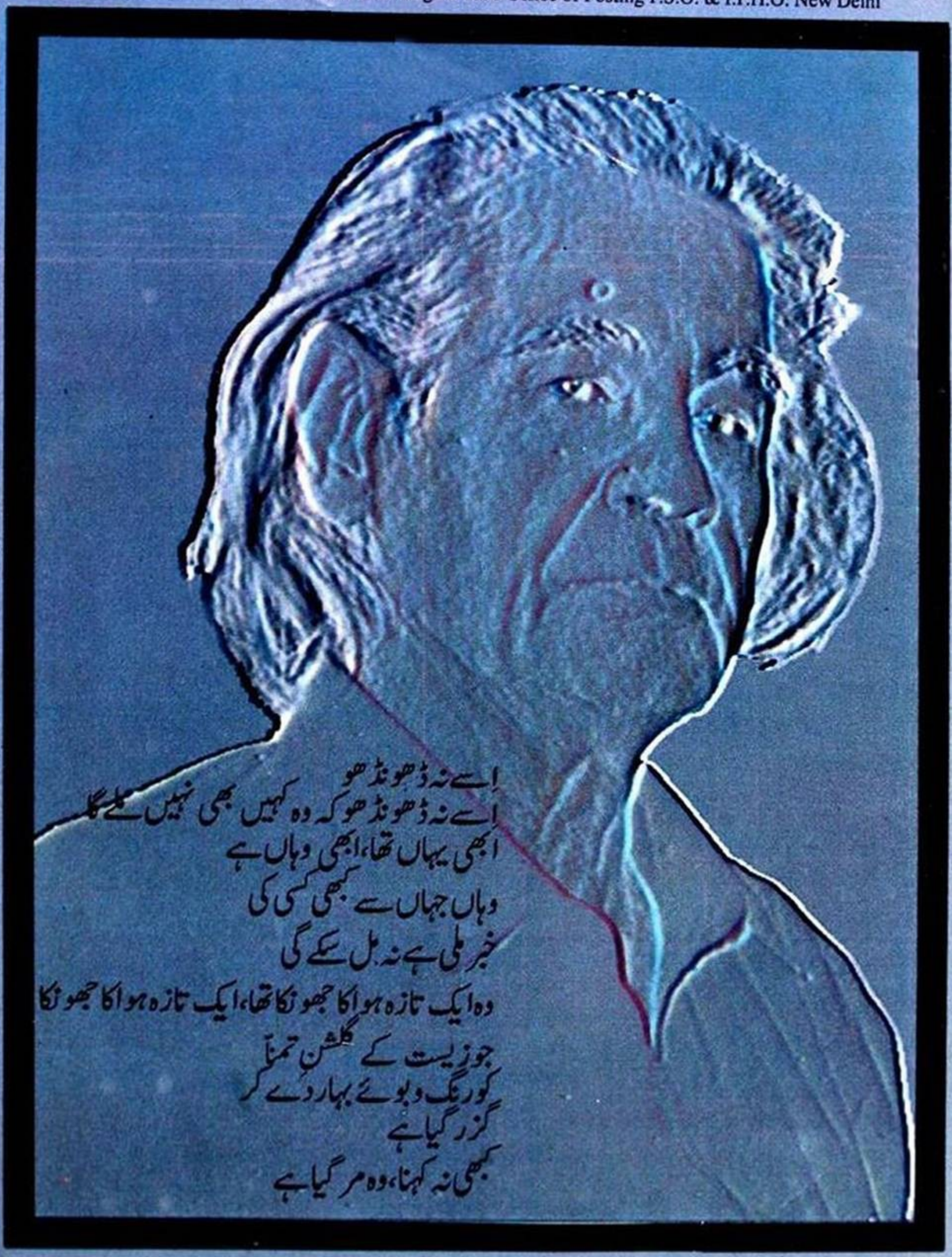

اِسے نہ ڈھونڈھو
اِسے نہ ڈھونڈھو کہ وہ کہیں بھی نہیں ملے گا
ابھی یہاں تھا، ابھی وہاں ہے
وہاں جہاں سے کبھی کسی کی
خبر ملی ہے نہ مل سکے گی
وہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھا، ایک تازہ ہوا کا جھونکا
جو زیست کے گلشنِ تمنّا
کو رنگ و بوئے بہار دے کر
گزر گیا ہے
کبھی نہ کہنا، وہ مر گیا ہے

علی سردار جعفری

ولادت: ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء وفات: یکم اگست ۲۰۰۰ء